نگار

مجلۂ علمیہ و ادبیہ

رئیس التحریر

نیاز فتحپوری

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

زیب النساء بیگم

نگار

رئیس التحریر: نیاز فتح پوری

معاون مدیر: مخمور اکبرآبادی

(رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴)

مجلد ۱ | شوال سنہ ۱۳۴۴ھ جون سنہ ۱۹۲۶ء | قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
شمار ۵ | | قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

فہرست

ملاحظات ۔ اڈیٹر ---------- ۲
جنگ سے پہلے ترکی کی سیاسی کشمکش ۔ اڈیٹر ---------- ۳
نگاہ بیدار ۔ حکیم احمد شجاع ---------- ۱۰
لالہ رخ ۔ لطیف الدین احمد ---------- ۱۱
فلسفۂ نیٹشے پر ایک نظر ۔ اڈیٹر ---------- ۲۵
طلوع آفتاب کی سرزمین ۔ اڈیٹر ---------- ۳۰
زیب النساء ۔ اڈیٹر ---------- ۳۳
دیہات کی صبح ۔ محمد میر خاں غربت (طارم) ---------- ۴۶
محسوسات عزیز ۔ عزیز لکھنوی ---------- ۴۷
علم الہیئت الجدیدہ ۔ اڈیٹر ---------- ۴۸
بیوی کی امانت ۔ حکیم احمد شجاع بی۔ اے ---------- ۵۹
اشتراکیت حربی ۔ اڈیٹر ---------- ۶۳
وردِ احمر ۔ تمکین قریشی سورونی ---------- ۶۹
اندلس کی شہزادی ۔ حافظ امام الدین اکبرآبادی ---------- ۷۰
غزل نیاز ۔ اڈیٹر ---------- ۷۴
معلومات ۔ اڈیٹر ---------- ۷۵

ملاحظات

(۱) اس مہینہ کی اشاعت میں پھر تعویق ہوگئی۔ یقیناً آپ کو اس سے تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن ہم مسرور ہیں کیونکہ اس تلخ تجربہ کی تکرار نے کارپردازانِ نگار کو آخر مجبور کر ہی دیا کہ اپنا پریس علیحدہ قائم کریں۔ امید ہے کہ جولائی یا اگست کا رسالہ نگار پریس سے شائع ہوگا۔

(۲) زیب النسا بیگم کی تصویر جو اس اشاعت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے عہدِ مغلیہ کی اُن باقیات الصالحات میں سے ہے جن کا کثیر حصہ اس وقت برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے۔ اصلی تصویر جس کی یہ نقل ہے، دہلی کے ایک قدیم خاندان کے قبضہ میں تھی اور عین اس وقت جب کہ برٹش میوزیم کے لئے نہایت گراں قیمت پر خریدی جا رہی تھی، ہمارے ایک دوست نے اس کی کاپی حاصل کرلی۔

یہ تصویر ایک ایرانی نقاشہ (غالباً نادرہ) کا کارنامہ ہے جو عہدِ عالمگیری میں دربارِ حرم سے وابستہ تھی اور اس فن میں خاص شہرت رکھتی تھی۔ اصل تصویر کی پشت پر جو عبارت درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النسا کے ہاتھ میں دیوانِ حافظ ہے۔ اور وہ کسی شعر سے متاثر ہو کر کسی خاص خیال میں مستغرق ہو جاتی ہے۔ چہرہ کی ساخت اور خدوخال کی کشش نمایاں طور سے بتا رہی ہے کہ یہ تیموریہ خاندان کی خاتون ہے۔ اور اُن تمام خواتینِ مغلیہ کی مصنوعی تصویروں سے علیحدہ ہے جو عام طور سے بازاروں میں نظر آتی ہیں۔

(۳) آیندہ مہینہ میں آفتاب کے متعلق اک بہترین مضمون شائع ہوگا اور اسی کے ساتھ تین تصویریں بھی ہوں گی جو نقاشیٔ فطرت کا بہترین نمونہ ہیں۔

(۴) ہمیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی کہ حکیم احمد شجاع (بی۔اے) جو افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کا خاص ذوق رکھتے ہیں ایک رسالہ "ہزار داستاں" لاہور سے جاری کر رہے ہیں، جس کا تنہا مقصود مختصر افسانہ نویسی کو رواج دینا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک رسالہ نونہال بچوں کیلئے بھی جاری کیا جائیگا۔ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ سرزمین لاہور نے جس قدر خدمت، اردو ادب کی انجام دی ہے، وہ ہمارے لئے باعثِ صد شکر ہے۔

(۵) اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ نگار حاسدانہ نگاہ سے دیکھا جانے لگا، کیونکہ اس سے زیادہ قوی ثبوت مقبولیت اور شہرت کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اڈیٹر

۷۸۶

نگار

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ	جون سنہ ۱۹۲۲ء، شوال سنہ ۱۳۴۰ھ	مجلد ۱ شمار ۵

جنگ سے پہلے ترکی سیاست کی کشمکش

ایک افادۂ تاریخی

طلعت پاشا کی سیاست نے نہ صرف تاریخ عثمانیہ بلکہ تمام مشرق کی تاریخ پر جو اثر ڈالا ہے وہ اس صدی کا نہایت روشن واقعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ طلعت پاشا کے بیانات نہایت قابل اعتماد تاریخی ماخذ سمجھے جاتے ہیں اور انکا ایک ایک لفظ جنس گرانمایہ خیال کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے رسالہ "تاریخ رواں" نے پاشائے مرحوم کا ایک بیان شائع کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی، جنگ سے قبل، کس سیاسی کشمکش میں مبتلا تھا اور کن حالات سے مجبور ہو کر اس نے جنگ میں حصہ لیا۔

طلعت پاشا نے یہ بیان برلن میں لکھا تھا جو واقعہ شہادت کے بعد شائع کیا گیا۔ ہم اُسے الہلال (مصری) سے ماخوذ کرکے یہاں درج کرتے ہیں، امید ہے کہ ناظرین دلچسپی سے پڑھیں گے۔

نیاز

جنگِ بلقان (سنہ ۱۹۱۰ء) کے بعد سلطنتِ ترکی کی سیاستِ خارجی کا کوئی خاص نصب العین نہ تھا، ترکی کبھی حکومت انگلستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہتا تھا اور کبھی جرمن نمایندوں کے سامنے اخلاص و صداقت کا اظہار

کرتا تھا اور دولِ یورپ کے سیاسی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ ترکوں کی سیاسی رفتار بھی بدلتی رہتی تھی۔

جنگِ بلقان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے یوروپین ترکی کے بہت سے صوبے کھو دیئے، جو صرف ہماری خارجی سیاست کی بدنظمی اور بے ترتیبی کا اثر تھا (یعنی ترکوں کا خارجی دنیا میں کوئی ایسا دوست نہ تھا جو مشکل وقت میں اُس کا ساتھ دیتا) اور اس لئے ہم نے پہلے اپنی سیاسی حالت کو درست کرنے کا عزم کیا، تاکہ اس کے بعد ہم اپنے ملک کی اقتصادی اور اجتماعی حالت کو سنبھال سکیں۔

اس وقت محمود شوکت پاشا، ترکی وزارت کے صدرِ اعظم تھے، جنہوں نے ان مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے ایک انجمن قایم کی تھی اور حقی پاشا، سابق وزیرِ اعظم کو اس کا صدر مقرر کیا تھا۔ یہ وہی حقی پاشا ہیں جو جنگِ عظیم کے دوران میں ترکوں کی طرف سے جرمنی میں سفیر تھے۔

حقی پاشا نے لندن میں اپنا نازک کام شروع کیا اور انگریزوں کے ساتھ رابطۂ اتفاق قایم کر کے پیرس روانہ ہوئے اور وہاں سے برلن کا قصد کیا۔

اسی اثناء میں روس نے ایک نہایت سخت لہجہ کی یادداشت ہمارے پاس بھیجی اور معاہدۂ برلن کی بعض شرائط پر عمل کرنے کا شدید تقاضا کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس یادداشت سے اصلاحِ حالات مقصود نہ تھی بلکہ ترکی معاملات میں دخل دینے کے لئے ایک بہانہ تلاش کیا گیا تھا۔

اس یادداشت اور اس کے اصلی اسباب کو دیکھ کر ہمیں اپنی سیاسی نزاکت کا پورا احساس ہوا اور ہم نے حقی پاشا کے پاس ایک برقی پیام اس مضمون کا بھیجا کہ "وہ انگریزی حکومت سے گفتگو کر کے اس کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ طے کرلیں، جس کی بناء پر انگریز، مسائلِ شرقیہ میں ہماری امداد کر سکیں اور اس طرح اُن مشکلات کا خاتمہ ہو جائے، جو روسی اور عثمانی اختلافِ اغراض کی وجہ سے رونما ہو رہی ہیں۔"

حقی پاشا نے انگریزی حکومت سے استدعا کی کہ وہ اپنے دو نمایندے بھیجکر حکومتِ عثمانی کے مشرقی صوبوں کی اصلاحی تجویز کا معائنہ کرے، جسے ہم نافذ کرنا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے اس کو منظور کیا اور دو نمایندے مقرر کر کے اُن کے نام شائع کر دیئے۔ اس کامیابی سے ہمیں ایسا نظر آیا کہ ہمارے سیاسی مطلع سے مشکلات کا ابر دور ہونا شروع ہو گیا ہے، لیکن جب اُس کو اس اتحاد کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے ان تمام سیاسی نفوذ کے ذریعہ سے، جو انگریزی حلقہ ہائے سیاست میں حاصل تھا، اس اتفاق کو توڑ دینے کی کوشش شروع کی اور آخر کار اُسے اس مقصد میں کامیابی ہوئی یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد انگریزی حکومت نے

اعلان کیا کہ وہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتے۔

ترکی اور جرمنی اسی اثنار میں جرمنی بھی ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی خواہش ظاہر کر رہا تھا اور ہمارے مبادی سیاست سے خاص دلچسپی لیتے ہوئے ہماری مشکلات کو دور کرنے کا وعدہ کر رہا تھا جب ہم نے اپنی اس کامیابی کے بعد دول کی مجلس سفرا سے اس بات کی استدعا کی کہ وہ ہمارے اور روس کے درمیان ایک مناسب فیصلہ کرا دیں، تو سوائے جرمنی سفیر کے سب نے یہی مشورہ دیا کہ روس کی شرطیں قبول کر لی جائیں۔ سفیر مذکور نے یہ کہا کہ "میں اپنے ذاتی اثر سے اور میری حکومت اپنی طاقت سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہے" چنانچہ اس کی بنا پر ہم باوجود روسی یادداشت کے اپنے سیاسی مساعی کو انجام تک پہونچانیکے قابل ہوئے۔ اور روسی مطالبات کو اصلاح عام کی فہرست میں داخل کر لیا۔ اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ عثمانی وزارت میں ایک بڑی جماعت جرمنی کی طرفدار پیدا ہو گئی جو صرف جرمنی کو سیاسی مشکلات اور دشواریوں میں اپنا معین اور مخلص سمجھتی تھی۔

چونکہ جنگ بلقان کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ یوروپین صوبوں کا بہت بڑا حصہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور بلقان میں ہمارا سیاسی و حربی توازن فوت ہو چکا تھا، اس لئے ہمیں ضرورت ہوئی کہ اتحاد ثلاثہ یا ائتلاف ثلاثہ میں سے کسی ایک کے ساتھ اتفاق پیدا کریں، تاکہ جنگ بلقان میں جس مرکز کو ہم کھو چکے ہیں اسے پھر حاصل کر سکیں۔

چونکہ روسی یادداشت کے متعلق جرمنی سفیر کے مواعید میں صداقت کی جھلک نظر آتی تھی اور انگلستان کے طرز عمل سے سرد مہری ٹپکتی تھی، اس لئے ہم جرمنی کے ساتھ اتحاد قائم کرنے پر مجبور ہوئے اور یہ تجویز نہایت خوشی و مسرت کے ساتھ قبول کی گئی، لیکن جب جرمنی حکومت سے اس کے متعلق گفتگو کی گئی تو اس نے جواب دیا کہ "جرمنی اس اتحاد کو کچھ زیادہ اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھتا کیونکہ ترکی ایک ضعیف سلطنت ہے مگر باوجود اس کے جرمنی کو یقین ہے کہ ایک ایسا وقت آنیوالا ہے جبکہ یہ اتفاق نہایت ضروری ہو جائیگا" اس جواب سے ہمارے ان تمام مساعی پر پانی پھر گیا جو ایک طاقتور حلیف پیدا کرنیکے لئے ہم کام میں لا رہے تھے کیونکہ اس وقت یورپ کی سلطنتیں طاقتور حلیف پیدا کرنے کی فکر میں تھیں، لیکن ہمارے شدت اضطراب کی وجہ سے اوائل سنہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے اتحاد کے متعلق پھر گفتگو شروع کی چونکہ اس وقت تک ہم نے اپنے سیاسی طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی اس لئے اس تجویز کو منظور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور آخر کار

بعد یہ جرمنی سفیر سے گفت وشنید کرنے کے بعد ہم نے جرمنی کے ساتھ ایک سیاسی اور حربی عہد نامہ کیا، جس کی تصدیق کے بعد بوسینیا اور ہرزگوینیا میں وہ منحوس واقعات رونما ہوئے جو اس جنگ عظیم کا سبب قرار دیئے جاتے ہیں۔

جس وقت ہم نے معاہدہ کی تصدیق کی ہے، جنگ کا بالکل احتمال نہ تھا، لیکن جب اسباب جنگ رونما ہوئے تو ہمیں یقین ہوگیا کہ جرمنی نے ہمارے ساتھ صرف اسی لئے اتفاق پیدا کیا ہے کہ جنگ کا وقت نزدیک ہے مگر باوجود اس کے ہمارا یہی اعتقاد رہا کہ ہمارا جرمنی کے ساتھ اتفاق کرلینا یقیناً مفید ہے

شرکت جنگ سے اجتناب

چند مہینے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ یورپ کی فضا نقارہائے جنگ سے گونجنے لگی اور اس کی ہولناک آواز تمام روئے زمین میں پہنچ گئی، اس وقت ہمیں اپنے سیاسی مرکز کی اہمیت کا احساس ہوا کیونکہ جنگ سے پہلے جو عہد نامہ ہم نے کیا تھا اس کے بموجب ضروری تھا کہ ہم ایک فریق کے ساتھ شریکِ جنگ ہو جائیں۔ ہر روز ہمارے پاس جرمن اور آسٹریا کے سفیر آتے اور ہم سے پوچھتے تھے کہ "تم کب جنگ میں شرکت کرکے اپنے اخلاص کا ثبوت دوگے اور کب اپنے وعدے پورے کروگے۔

اس وقت ممکن تھا کہ ہم یہ جواب دیتے کہ "اٹلی بھی اتحاد ثلاثہ کا ایک رکن ہے مگر باوجود اس کے اس نے اب تک اعلان جنگ نہیں کیا ہے اور جرمنی نے بھی اس معاہدہ کا احترام نہیں کیا، جس کی رو سے بلجیم کو غیر جانبدار رہنا چاہیے" لیکن اس قسم کا جواب حقیقت میں اس جدید معاہدہ کو بالکل توڑ دیتا جسکے حصول میں ہم نے اپنی پوری کوشش سے کام لیا تھا اور معاہدہ کا نقض ہمارے عہد وپیمان کو ساقط الاعتبار کردیتا، اسلئے ہم نے جرمنی کو ایسے سیاسی جوابات دینے شروع کئے، جس سے نہ معاہدہ کے شرائط پر کچھ اثر پڑتا تھا اور نہ جنگ میں عاجلانہ شرکت کی آمادگی پائی جاتی تھی۔ ہم نے جرمنی سے کہا کہ "ترکی اپنے عہد پر نہایت امانت اور اخلاص کے ساتھ قائم ہے اور عنقریب ضرورت کے وقت اپنی طاقت کو اپنے حلیف کے ساتھ شامل کرنے والا ہے، کیونکہ اس طریق سے ہم اپنے وعدے بھی پورے کرسکیں گے اور روس کے مقابلہ میں جو ہر وقت ہم پر حملہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا ہے، اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں گے۔ لیکن مصلحت کے بالکل خلاف ہے کہ ہم ابھی سے اپنی طاقت تمہارے ساتھ شریک کردیں کیونکہ ہمارے درمیان بلغاریہ کی حکومت حائل ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ جنگ کے متعلق پہلے ہم بلغاریہ کی رائے معلوم کرلیں، اگر وہ جنگ میں شرکت چاہتا ہے تو اس صورت میں ترکی کے لئے جنگ میں شریک ہونا ناگزیر ہے۔ کیونکہ ہم نے بلقانی جنگ میں اپنے تمام قلعے، استحکامات اور خطوط مدافعت کھو دیئے ہیں جن کی وجہ سے ہم بلقانی خطرات سے محفوظ رہ سکتے تھے علاوہ اس کے یہ بھی

ممکن ہے کہ ہم اس طرح بلغاریہ کو بھی اپنی طرف مائل کر لیں کیونکہ اُس کے اور سرویہ کے درمیان قدیمی عداوت ہے" اس معقول جواب نے جرمنی سفیر کے دماغ پر بڑا اثر کیا اور ہم بھی اس جواب کے ذریعہ سے جنگ کو عارضی طور سے ٹال سکے۔ تاکہ اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کر سکیں۔

اس عرصہ میں اس قسم کی اشاعتیں کثرت سے ہونے لگیں کہ دول اتحاد (انگلستان، فرانس وغیرہ) نے ہم سے متعدد بار استدعائیں کیں کہ ہم اُن کے ساتھ شریک ہو جائیں لیکن اس قسم کی اشاعتیں بالکل حقیقت سے دور تھیں اور جنگ عظیم کی ابتدا سے واقعہ بحر اسود تک دول اتحاد نے کوئی سرکاری تحریر ہماری پاس نہیں بھیجی، البتہ سفرائے دول کی مساعی صرف اس بات پر منحصر تھیں کہ وہ ہمیں غیر جانبدار رہنے کا مشورہ دیتے اور کہتے تھے کہ اگر تم غیر جانبدار رہے تو ہم عثمانی سلطنت کی حفاظت میں تمہاری مدد کریں گے اور یہ وہی وعدہ تھا جو پیرس کانفرنس ۱۸۵۶ء سے ہمارے ساتھ کیا جا رہا تھا، اس لئے ہم ان وعدوں پر اعتماد نہ کر سکے اسی اثنار میں انگلستان نے ہمارے دو جنگی جہاز "عثمان اول" اور "رشادیہ" پر قبضہ کر لیا جو انگلستان میں بن رہے تھے، اس حادثہ سے عثمانی پبلک میں اور زیادہ ہیجان پیدا ہوا اور سب کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں نے یہ صرف اس لئے کیا ہے کہ یونانی بیڑہ کو بحرہ اسود میں طاقتور بنا دیں۔

لڑائی کے ابتدائی مہینوں میں فتح، جرمنی فوجوں کے حصہ میں رہی اور مارن کی ناکامی کے باوجود بھی جرمنی کا باخبر حلقہ یہی خیال کرتا رہا کہ آخری فتح انہیں کے حصہ میں رہیگی، ادھر دول اتحاد کے سفرار باب عالی کی سیاست سے پہلے ہی خوفزدہ تھے کہ اسی اثنار میں جرمنی کا حربی وفد آیا اور جرمنی کے دو آہن پوش جہاز غوبن اور برسلو کے نام بدل دینے سے اُن کو اور زیادہ شک پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے جرمنی بحری فوج کی موجودگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس وقت ہمیں انکی حجت کی قوت اور اپنے مرکز کی نزاکت کا پورا احساس ہوا لیکن سفرائے اتحاد نے سوائے احتجاج کے اور کوئی کارروائی نہیں کی اور یہ صرف اس لئے کہ ہم برافروختہ ہو کر غیر جانبداری کو نہ چھوڑ دیں۔

بلغاریہ اور رومانیہ جب جرمنی نے باہمی معاہدہ کو عملی صورت میں لانیکے لئے جنگ میں شریک ہونیکا ہم سے اصرار کیا تو ہم نے پہلے بلغاریہ کی رائے معلوم کرنے کا قصد کیا، چنانچہ وزارتِ عثمانی کا ایک خاص اجتماع ہوا اور ایک طویل مباحثہ کے بعد یہ قرار پایا کہ جنگ کے متعلق بلغاریہ کی رائے معلوم کرنیکے لئے ایک وفد بھیجنا چاہیے، وفد مذکور کی صدارت میرے ذمہ کی گئی، میں روانہ ہوا اور میرے ساتھ خلیل بک مجلس مبعوثین (ہوس آف کامنز)

کے صدر بھی تھے، وہاں پہونچکر ہم نے موسیو راڈوسلاوف صدر وزارت بلغاریہ اور موسیو جناڈیف وزیر خارجیہ سے ملاقات کی، ان دونوں کے ساتھ پہلے سے ہماری ذاتی ملاقات بھی تھی۔ طویل گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ اُن کا طرزِ عمل رومانیہ پر موقوف ہے، بلغاریہ، سرویہ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے پوری طرح طیار تھا اگرچہ یونان بھی سرویہ کی مدد کرتا، لیکن اُسے رومانیہ کی طرف سے خوف ہے خاصکر جبکہ روسی جرار لشکر اسکے قریب موجود ہو، اس لئے سخت دشوار تھا کہ بلغاریہ کو اس سے قبل کہ وہ اپنے ہمسایہ رومانیا کے خیالات معلوم کرے ہولناک جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دیجائے چنانچہ ہم صوفیا کو چھوڑ کر بخارسٹ روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں جرمنی کی طرف سے فون کلیمین رومانیہ میں سفیر تھا اور کونٹ فیرنن آسٹریا کا سفیر اور موسیو راڈوف بلغاریہ کی سفارت پر مامور تھا اور برتیانو رومانی وزارت کا صدر تھا، ہم نے اپنی باہمی قرارداد کے موافق پہلے شاہ رومانیہ پھر وزیر اعظم اور وزیر خارجیہ سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی، شام کے وقت ہم کسی سفارت خانہ میں جمع ہوتے اور اُن معلومات پر بحث کرتے تھے جو دن کو ہمیں حاصل ہوتی تھیں اور آیندہ دن کے لئے اپنا نظام عمل طے کرتے تھے، طویل مباحث کے بعد معلوم ہوا کہ رومانی حکومت غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے اور موسیو برتیانو نے زبانی وعدہ کیا کہ ہماری حکومت ہمیشہ غیر جانبدار رہیگی خواہ بلقانی سیاست میں کچھ ہی انقلاب ہو۔ راڈوسلاوف نے تحریری وعدہ چاہا، اور ہم نے بھی موسیو برتیانو سے باضابطہ عہد نامہ کی تکمیل چاہی، لیکن اُس نے جواب میں کہا کہ ”رومانیا نے دنیا سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہیگا، لیکن چونکہ اس وقت سرویا جنگ میں شریک ہے، اس لئے اگر ہم بلغاریہ سے تحریری وعدہ کرلینگے تو وہ اپنے ہمسایہ سرویہ پر حملہ کرنیکے لئے دلیر ہوجائیگا۔ اور ہمارا یہ عمل غیر جانبداری کے خلاف ہوگا' بنابراں ہم اسے منظور نہیں کرسکتے، لیکن میں زبانی وعدہ کرتا ہوں کہ اگر سرویا اور بلغاریہ کے درمیان جنگ بھی چھڑ جائی تو ہم اپنی غیر جانبداری پر قایم رہیں گے“

بلغاریہ نے رومانیہ کے صرف زبانی وعدے پر جنگ میں شرکت منظور نہیں کی اور ہم قسطنطنیہ واپس ہوئے، اس حال میں کہ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمارا وفد ناکام رہا ہے، لیکن یہ مجھے معلوم نہیں کہ بخارسٹ اور قسطنطنیہ میں دول اتحاد کے سفراء کو اس گفتگو کی خبر ہوئی یا نہیں۔ بہرحال سفر سے واپس آنے کے بعد ہماری وہی حالت رہی جو پہلے تھی۔

اعلان جنگ روز بروز ہمارے سیاسی مرکز کی نزاکت بڑھتی جاتی تھی، خاصکر جب سے کہ جرمنی کا بحری وفد

قسطنطنیہ میں آیا، اور شہر کے راستوں اور مجالس عمومی میں وہ ہر جگہ نظر آنے لگے۔ اتفاق سے اُس وقت بحر اسود کا واقعہ پیش آیا اور صورت اس کی یہ ہوئی کہ امیرال شوسون نے بحری بیڑے کو حرکت دیکر بحر اسود کی طرف اس کا رخ کیا، اور روسی بیڑے اور بعض تجارتی بندرگاہوں پر گولہ باری کی جس کی خبر باب عالی کو اس واقعہ کے پیش آجانیکے بعد ہوئی، عام طبقہ یہی سمجھتا رہا کہ باب عالی کو پہلے سے اسکی خبر تھی لیکن میں دوران جنگ میں اس اشاعت کی تکذیب کرتا رہا اور اب بھی تکذیب کرتا ہوں (جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے) کہ مجھے اس واقعہ کی خبر بالکل اسی طرح ہوئی، جیسی کہ ایک عام رعایا کے فرد کو ہوتی ہے (یعنی واقعہ کے حادث ہونیکے بعد) وزارت نے بھی اس عمل سے موافقت نہیں کی اور اس کے کسی عضو نے اس کا اعتراف نہیں کیا بلکہ ہر ایک ممبر کو اس واقعہ سے رنج ہوا، یہانتک کہ محمود جورک صولو پاشا، سلیمان آفندی بستانی اور اوسقان آفندی نے استعفا دیدیا اور جاوید بے نے صراحتاً کہدیا کہ اگر اس مسئلہ کا مناسب طریقہ سے فیصلہ نہ ہوا تو میں بھی استعفا دیدونگا۔ سعید حلیم پاشا جو اس وقت صدر اعظم تھے انھوں نے یہ طے کیا کہ جب وزارت ایک اجتماع کے بعد کسی آخری فیصلہ پر پہنچ جائیگی تو وہ بھی استعفا دیدیں گے۔

اب ہمارے سیاسی مرکز نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی تھی، اس وقت ہمارے سامنے دو راستے تھے یا تو ہم جرمنی سے مل جائیں یا ایک مناسب طریقے پر اس سے عذر کریں، موخر الذکر صورت میں کچھ عرصہ کے لئے قیام امن کی امید تھی۔ چنانچہ ہم نے سلیم پاشا کے مکان پر ایک خاص جلسہ کیا اور نہایت نازک مباحث کے بعد یہ طے کیا کہ وزیر اعظم اور وزیر خارجہ دول اتحاد کے سفراء سے اور خاصکر سفیر اس سے ملیں اور مسئلہ کے تصفیہ میں اپنی انتہائی کوشش صرف کریں۔

لیکن اس واقعہ کے بعد روسی سفیر نے نہایت سخت لہجہ میں صدائے احتجاج بلند کی اور اس کے بعد دول اتحاد کی طرف سے صدائے احتجاج اُٹھی، انگلستان اور فرانس نے دوستانہ طریقہ پر اس مسئلہ کا تصفیہ چاہا اور انھوں نے یہ تجویز کی کہ گوبن اور بریسلو آہنی پوشوں کو غیر مسلح کر کے جرمن بحری افسروں کو علحدہ کر دیا جائے جو ان جہازوں میں کام کرتے ہیں، اور ترکی حکومت جرمنی کے ساتھ خفیہ تعلقات کو ختم کر کے اپنی غیر جانبداری کو پوری طرح محفوظ رکھے، لیکن ہم ان شرطوں کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ ہمارے اور جرمن معاہدے کے بالکل خلاف تھیں۔

ہم نے دوبارہ اجتماع کیا اور حالتِ موجودہ کا نہایت غور سے مطالعہ کر کے واقعہ بحر اسود پر نہایت افسوس کیا

لیکن اُدھر دول اتحاد کو معلوم تھا کہ ہم جرمنی کی مدد کرنا چاہتے ہیں، اور اِدھر ہمارے پاس بھی دول اتحاد پر اعتماد کرنیکے اسباب موجود نہ تھے، اس لئے ہم نے سوچا کہ اگر ہم غیر جانبداری پر قایم رہے تو اس صورت میں ہمارا نقصان ہے، کیونکہ حلفار (جرمنی وغیرہ) چاہے کامیاب ہوں یا ناکام، جرمنی ہمارا سخت دشمن ہو جائیگا اور دُول اتحاد کو اگر فتح ہوئی تو وہ بھی ہم سے ضرور اپنا انتقام لیں گے کہ کیوں ہم جرمنی کی طرف مائل ہو گئے تھے ان حالات کے ماتحت ہمارے لئے چارہ کار اور کوئی نہ تھا سوائے اس کے کہ اپنی قوت کو جرمنی کے ساتھ شامل کر دیں۔ چنانچہ میں نے اپنے وطن کو ہلاکت کے غار میں ڈالنا پسند نہیں کیا۔ اور یقین کر لیا کہ جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہونا بہر حال بہتر ہے۔

اس اثناء میں جبکہ ہم اپنے نتیجہ کی جانب سے سخت پریشان تھے (واقعہ بحر اسود کے بعد) ہمیں یہ خبر ملی کہ روس قفقاز کے حدود پر اپنی فوجیں جمع کر رہا ہے، اب ہمیں بالکل تردد نہیں رہا اور میں نے اپنے رفقا کو وزارت میں اعلان جنگ کا مشورہ دیا۔ جب یہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی اور اجتماع برخاست ہوا تو ہم نے سفرائے دولِ اتحاد کی شرطیں رد کر دیں اور اعلان کر دیا کہ ہم جرمنی کے ساتھ ہیں۔

نیاز

نگاہ بیدار

اثر:۔ حکیم احمد شجاع

ساقی نے عجیب مے پلائی
وہ کیف شب سیاہ لائی

جس کیف کا ساز خامُشی ہے
جس کیف کا سوز بیخودی ہے

شاخوں پہ پھول سو گئے ہیں
پتے بیہوش ہو گئے ہیں

سرہنگ فلک بھٹک رہے ہیں
تارے آنکھیں جھپک رہے ہیں

حرکت مسدود ہو گئی ہے
شورش نابود ہو گئی ہے

ہر شے پہ سکوت حکمراں ہے
خاموشی متاعِ کارواں ہے

شاعر کی، مگر نگاہ بیدار
اس عالمِ بیہشی میں ہشیار

بیگانۂ عیش، جستجو سے
بیتاب نظارۂ آرزو سے

خوابیدہ جہاں کی پاسباں ہے
اس حسنِ خموش کی زباں ہے

لالہ رُخ

"آتش پرستاران فارس"

"لالہ رخ" کے گذشتہ دو افسانے بہت پسند کئے گئے، اور کثرت سے لوگوں نے حضرت لطیف کی بابت مجھ سے سوال کیا۔ اگر انہوں نے اشاعتِ اولین میں "عناصرِ نگار" کو بغور ملاحظہ کیا ہوتا، تو شاید انہیں زحمتِ استفسار گوارا نہ کرنی پڑتی، تاہم میں یہ ظاہر کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ "جنابِ لطیف" نگار کے اکتشافاتِ ادبیہ میں سے ہیں اور نگار بجا طور پر یہ فخر کر سکتا ہے کہ اس نے ادبیات کے سلسلہ میں ایک ایسی ہستی کو نمایاں کر دیا، جو اس سے قبل پردۂ خفا میں تھی۔

اس نمبر میں جو افسانہ شائع کیا جاتا ہے، وہ لالہ رخ کا بہترین افسانہ ہے اور لطیف کے ذوقِ ادب کا ایک اور تازہ ثبوت۔

اڈیٹر

خلیج عمان کے گوہر آفریں ساحل اور اس کے نخلستانی جزیرے، چاندنی کی لطیف و نازک چادر میں لپٹے ہوئے سو رہے ہیں، چاند نے اپنے شباب کی لطافت و خوبی کے ساتھ تمام موجودات کو غرق تنویر کر رکھا ہے، اور فطرت اس دریائے نور میں نہا نہا کر نکھر رہی ہے۔

ہر چیز ساکت ہے اور ہر منظر خاموش، ہوا ساکن ہے اور پانی کی طرح خشکی بھی آثار حیات سے محروم۔ غیر منتظم وقفوں کے بعد اگر ہوا کو ایک غیر محسوس جنبش ہوتی بھی ہے تو اس احتیاط کے ساتھ کہ درختوں کی پتیوں اور امواج آب کی نیند میں خلل نہ آئے۔ سمندر کا ٹھیرا ہوا پانی اور اس پر چاند کی شفاف روشنی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتیوں کو سنہری شراب میں حل کر کے فرش مرمریں پر پھیلا دیا گیا ہے۔ اس سکونِ شیریں میں ہر چیز خوابیدہ ہے اور چشمِ انجم کے سوا اس وسعتِ تنویر کو دیکھنے والا کوئی اور نہیں ہے

شہر ہرمزیہ کی آبادی اور امیر کے محلات، جہاں کچھ دیر قبل عشرت ہنگامہ آرا تھی اس وقت یکسر خاموش تھی، اور امیر ہرمزیہ، الحسن العربی، جسکی محبت اپنی اکلوتی لڑکی کے ساتھ عدیم المثال نہ تھی تو عجیب د

عجیب ضرورتی، سورہا تھا۔ اس حکمراں نے اپنے نور نظر کے راحت و آرام کے لئے قصر و ایوان شاہی کی تعمیر و آراستگی میں وہ سب کچھ اہتمام پیش نظر رکھا تھا، جو اس کی امارت و محبت اور اس کی محبوب بیٹی کے حسن دلکش کیلئے موزوں و مناسب ہو سکتا تھا، فن تعمیر کے ماہر اور صناعی و نقاشی کے بہترین اُستاد جہاں کہیں بھی تھے بلائے گئے تھے، کہ اس محبت کی مادی مثال قائم کر دیں، غرض فراوانی دولت اور ترقی علم و فن کی متفقہ کوششیں جو نتیجہ پیدا کر سکتی ہیں، وہ اس قصر کی شکل میں ظاہر تھا۔ اور صرف اس جذبۂ محبت ہی کے ماتحت نہیں، کہ اُسکا یہ گوہر مکنون اپنے حجلۂ جمال میں محفوظ رہے، بلکہ آشوب زمانہ کے خیال سے بھی کوہ ارارات کی بلند چوٹی پر، جو ہر سمت دشوار گذار چٹانوں اور عمیق غاروں سے محصور تھی، یہ قصر حسین تعمیر ہوا تھا۔

ہر چند عربستان کے باشندے ملک کی غیر شادابی کی مناسبت سے ایک کرخت و نا ملائم نسل کہے جاتے ہیں، لیکن اس سرزمین حسن و عشق کے افسانہ ہائے محبت اس کلیہ کی تکذیب کے لئے کافی سے بہت زیادہ ہیں، علی الخصوص ہندہ ایسی پری تمثال اور زہرہ جبیں دوشیزہ کا افسانہ، جس کا حسن و جمال گویا ایک چشمہ تھا جو اپنے خشک کوہستانی ہیچ کو سدا بہار چمن بنا دینے والا اور شہرت عربستان بلکہ دنیا کی تاریخ معاشقہ میں بہترین رومان بننے کے لئے رونما ہونیوالا تھا۔

دنیس کی ہستی اگر ایک قوم کی عقیدت مندیوں کا نتیجہ تھی، سائکی کا وجود اگر شعراء کی خیال آفرینیوں کا مجسمہ تھا، تو ہندہ ساری کائنات کے لئے وجہ پرستش تھی، کہ اس کے جلووں کی دنیا قوس قزح کی رنگینیوں سے معمور تھی، اس کے تنفس کی فضا پھولوں کی نکہت سے بسی ہوئی تھی، اس کی حرکات میں موجوں کا لوچ شامل تھا، اس کا جسم خوبانیوں کا گداز اور سیبوں کی شیرینی سے مملو تھا، اور اس کے پیکر میں حوروں کی لطافت آسودہ تھی۔

حُسن کی پرستش ہمیشہ ہوا کی ہے، قلم و دماغ سے پیدا ہونے والے بہترین موتیوں کے ہدایائے نیائش، معابد حُسن و جمال پر ہمیشہ چڑھائے جاتے رہے ہیں، کیونکہ حُسن جہاں اور جس حالت میں بھی ہو، ایک دل سے جو پتھر نہیں مگر دل ہے، ہدیۂ نیاز کا متمنی ہوا کرتا ہے۔ پھر کون ہے جو اس تمنائی پذیرائی میں ایک لمحہ کا تامل کرے اور کب ایسا ہوا ہے کہ جذبات نیاز کا ہدیہ آسمان ناز تک نہ پہونچا ہو، لیکن وہ غزلیں جو حسن بے حجاب کی مدح سرائی میں کہی گئی ہوں، وہ قصیدے جو حسن عریاں کے مندر پر گاڑی گئے ہوں، اس مجسمۂ عفت و نزاکت کے حُسن و لطافت کو کیونکر سراہ سکتے ہیں، جو عالم کی نظروں سے مستور رہ کر ایک

مخصوص فضا کو اپنے جلووں سے منور اور تابشِ جمال سے معمور کرتا رہتا ہے۔

وہ پھول جو عُمقِ بحر میں (جہاں آفتاب کی شعاعیں بھی نہیں پہنچ سکتیں) انسان کی نگاہوں سے مخفی رہ کر شگفتہ ہوتا ہے، ہندہ کی عصمتِ جمال سے، جو ایک مقدس راز کی طرح محفوظ تھا، کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا۔

جس طرح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اس شخص کی خوشی و مسرت کا جو دفعتہً اپنے تئیں پرستان کی حدود میں پائے، اور جس کا سونا جاگنا وہاں کی نسیمِ نزہت انگیں پر منحصر ہو، اسی طرح کون اندازہ کر سکتا ہے اس ہستی کی خوش طالعی کا جس کے مبارک ہاتھ اس نقاب کو کھولیں گے جس میں ہندہ کا جمال مستور ہوگا۔

ہر چند کہ نہایت حسین ہوتی ہیں یمن کی لڑکیاں جب وہ نقاب ڈال کر شامِ گرما میں اپنی شبستانِ ناز سے وادیوں کی سیر کو نکلتی ہیں، اور جن کے حُسن کی چھوٹ سے نقابِ گل رنگ نظر آنے لگتے ہیں؛ اور بہت دلفریب ہیں اُس کی کتخدا لڑکیاں جو چنبیلی کے اُن سفید و نازک پھولوں کی طرح جنہیں وہ پہنتی ہیں، خود بھی حسین و نازک ہوتی ہیں، اور جن کا حجلہ ہائے عیش میں آئینوں کے سامنے صرف خود بینی رہنا ہر لحظہ فروغِ جمال کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ عرب کے عشرت سراؤں میں اس وقت تک کوئی کنواری یا بیاہی متبسم نہیں ہوئی جس کے پندارِ حُسن کو حُسن کی بہار سامان دوشیزہ کے جلوۂ بے پناہ نے توڑ نہ دیا ہو۔

ہندہ، خصوصیاتِ نسائی کا مکمل ترین نمونہ ہونے کے ساتھ ہی اپنے حُسن میں ایک الوہیت بھی رکھتی تھی اور جس طرح زمرد کی شعاعیں سانپ کی بصارت کو زائل کر دیتی ہیں، اسی طرح اس کی آنکھوں سے نکلنے والی معصوم نگاہیں بھی ایک بدنظر انسان کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھیں۔ اس لئے کہ اس کی ہر دنیاوی جسم اور جذبہ میں اک الہانہ شعلہ کی تابش نمایاں ہوا کرتی تھیں، اور جس طرح چاند کی روشنی، درخت کی پتیوں سے چھن چھن کر باوجود گونہ تاریک ہونے کے تمام روشنیوں میں دلکش نظر آتی ہے، اسی طرح ہندہ کا حُسن بھی سب سے نمایاں تھا اور دنیا والے اگر ہندہ کو انسان کہہ کر فخر کر سکتے تھے تو آسمان والے بھی، اس میں نصف سے زیادہ ملکوتیت کے مدعی تھے۔

۲

اس سکوتِ مطلق میں ہندہ، اپنے شبستانِ عیش کے غرفہ میں کھڑی ہے اور گیسو شانوں پر منتشر ہیں۔ کیا وہ اس وقت چاندنی میں نہائے ہوئے منظر کا لطف حاصل کرنے آئی ہے؟ کیا اس نظارہ میں

ہ، اس کے لئے اس درجہ کشش ہے کہ اس وقت جبکہ اُسے بالشِ ناز پر محوِ خواب ہونا چاہیے، بیدار ہوکر باہر آگئی ؟ نہیں اس کی چشمِ نمناک اور حرکتِ دل کی سرعت شاہد ہے کہ اس کے جذبات اس وقت کسی کشمکش میں ہیں، دامنِ کوہ پر اس کی نظریں قایم ہیں اور اس کا رہ رہ کر مضطرب ہو جانا، بتاتا ہے کہ وہ کسی کے انتظار میں ہے۔

اسے حُسن، تو اس وقت محوِ خواب ہے اور بالکل بے خبر کہ جس کے راحت و آرام کے لئے تو نے ہر ممکن اہتمام کیا ہے، اُسکی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں، اس کا دل شوق و خوف کی کشاکش میں تباہ ہوا جارہا ہے، تجھ سے کون کہے، کہ بلند ترین عمارات بھی، پروازِ محبت کے لئے سطحِ ہموار سے زیادہ نہیں، محبت کے لئے تو سریع الحصول غنائم میں کوئی دلکشی ہے ہی نہیں، اس کو تو وہی تحائف عزیز و محبوب ہوتے ہیں، جو خطرات میں پڑکر حاصل کئے گئے ہوں، موتیوں کی طلب میں سکونِ بحر کا انتظار مسلکِ عشق میں روا نہیں۔ اس کے غوطے کا وقت تو وہ ہے، جب طوفان اپنی زندگی کی تمام طاقتیں صرف کر رہا ہو، پھر محبت ہی تو ہے جو اس جوشِ طوفان کی تہہ میں سے بہترین موتی حاصل کرلیتی ہے۔

ہندہ کا حُسن اب وہ گُلِ بیگانہ نہ تھا جس کی نکہت اپنے عروج تک نہ پہونچی ہو۔ ہرچند اس پھول کی رعنائی بلند مکان کی دیواروں اور دشوار گذار چٹانوں کی حفاظت میں مستور تھی، تاہم ایک ہستی تھی جو محض اسی کیلئے سراپا اضطراب ہو رہی تھی اور جس کی آنکھیں اس ناطورۂ عرب کے حُسنِ شاداب کی پیاسی تھیں، جس کے ہاتھ اس تک پہنچنے کی سعی میں چٹانوں سے زخمی ہو جانیکے لئے بیتاب تھے، اور جس کے قدم ارارا ٹ کی بلندی پر چڑھنے کے لئے بے چین تھے۔

خلیج کی ساکن سطح کی انتہائی حد سے ایک کمزور روشنی نظر آئی جو دامنِ کوہ کی سمت بڑھتی گئی اور قریب تر ہونے پر پتھواروں سے پیدا ہونیوالی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ ڈانڈوں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کھینے والا وقت کا کوئی لمحہ ضائع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ کوشش کر رہا ہے کہ کشتی اپنی انتہائی رفتار سے بھی زیادہ تیز چلے، بہاؤ اس درجہ تیز تھا کہ کنارے لگنے پر کشتی پتھر سے ٹکرائی اور ایک غیر معمولی آواز پیدا ہوئی۔

روشنی کے اولین نظارہ سے ہندہ کے چہرہ پر شوق اور خوشی کے رنگ کا غازہ چڑھ چکا تھا، اس لئے کشتی کے ٹکرانے کی آواز سنتے ہی اس کے بازو کشادہ ہوگئے، گویا وہ آنیوالے کو نیچے ہی سے اپنی آغوش میں اُٹھا لینا چاہتی تھی۔ رات کے سکوتِ مطلق میں، اس عروسِ عرب نے، جب اپنے سنہری کاکلوں والے محبوب کو آتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل جو ابھی ابھی خوف و یاس سے پامال ہوا جارہا تھا، افتخار و محبت

سے بھر گیا۔ ابھی اس نے نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ راستہ کی دشواری کا دفعتًا احساس ہوا اور ہندہ سر جھکا کر دیوانہ وار پکار اُٹھی "تو میرے بال پکڑ لو اور چڑھ آؤ میرے حبیب!" آنے والا مشتاق ہیرو اس وقت شوق و شباب کے پر لگائے ہوئے اُڑ رہا ہے، عربستان کی بکریاں اپنی سنگستانی چراگاہوں میں اتنی سبک جست نہیں کرتیں۔ جس قدر سرعت کے ساتھ اس ہیرو نے یہ دشوار گذار راستہ طے کیا۔

ظاہر ہے کہ ہندہ کو اس آنے والے کے ساتھ عشق تھا کیونکہ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا محبوب کون ہے اور پھر بھی وہ ناموس خاندانی اور قیود مذہبی کی طرف سے بے پرواہ ہو گئی، جنت نشان ہندوستان کے کنجہائے باغ میں کبھی کبھی ایسی حسین و خوشرنگ چڑیا نظر آجاتی ہے، جو کوئی نام نہیں رکھتی اور صرف یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ وہ نسیم کے جھونکے کے ساتھ کسی ایسے جزیرے سے اُڑ آئی ہے، جہاں ہنوز انسانی تلاش و جستجو کے قدم نہیں پہونچے، پھر یہ چڑیا دیکھنے والے کی نگاہوں کو ایک قلیل عرصہ کے لئے مسحور کر کے جس طرح آئی تھی اُسی طرح چلی جاتی ہے۔ ہندہ بھی اپنے تئیں کسی ایسے ہی کنج میں سمجھتی تھی اور اپنے عاشق کو کسی ایسی ہی چڑیا سے تعبیر کرتی تھی۔ یہ خیال کہ اس کا محبوب اس چڑیا ہی کی طرح تو غائب نہ ہو جائیگا۔ اُس کیلئے اذیت روح کا باعث ہوا کرتا تھا اور وہ ایک ارتعاش خفی کے ساتھ "خدا نہ کرے" کہہ کر اس اندیشہ کو رفع کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

۳

اب سے ایک مہینہ قبل، جب دنیا بہ اندازہ یک ماہ جوان تر تھی۔ یہی رات تھی اور یہی چاند۔ کہ ایک غیر محسوس خیالِ تنہائی سے تنگ آکر ہندہ نے اپنی بیش خدمتوں کو رخصت کر دیا تھا کہ اس کا یہ احساس تنہائی غیر مکمل نہ رہے۔ یہ حالت اس پر اکثر طاری ہو جاتی تھی اور اس خیال سے کہ اس کی اس حالت کا راز نہ کھلے خود تنہا رہنا پسند کرتی تھی۔ اس رات بھی وہ اسی کیفیت سے متاثر تھی اور اپنی خلوت کو پُر کرنے کے لئے اُس نے اپنا قانون اُٹھا لیا تھا، تاروں کو یوں ہی سا چھیڑنے کے ساتھ کچھ گنگناتی بھی جاتی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس شغل میں اس کا شوق نغمہ و موسیقی شامل تھا یا نہیں، کچھ ہی سمجھا جائے مگر حقیقت یہ ہے کہ موسیقی کا دیوتا اپنی نذر کے لئے ایسے ہی اچھوتے نغمے پسند کرتا ہے جن کا کوئی سُننے والا نہ ہو اور عرض نغمہ کرنے والی ذات خود بھی بے توجہ ہو۔ اس وقت ہندہ بھی اپنے کومل اور مدھم سروں میں شاید بھی نامعلوم فرض ادا کر رہی تھی، یا پھر یہ بات تھی کہ چاند کی نرم اور ٹھنڈی روشنی اس کے جیاتِ شباب اور جذبات

تنہائی کو گدگدا رہی تھی اور وہ تار و مضراب کے ذریعہ سے اس گدگدی کو دور کرنا چاہتی تھی، اس جادو اثر وقت محو عزاگیں لحہ میں دفعتہً اس کی نظر اٹھی اور جھروکے میں سے کسی کو جھانکتا ہوا دیکھا۔ یہ اس کے اس نامعلوم عاشق کا چہرہ تھا۔

پہلا خیال جو ہندہ کے دماغ میں اس نظارہ کے بعد آیا وہ یہ تھا کہ محل میں اس وقت انسان کا گذر تو محال ہے اس لئے وہ شکل ضرور کسی آسمانی ہستی کی ہے جو اپنے ماہتابی سفر میں موسیقی سے متاثر ہو کر وہاں اتر آئی ہے اور پھر اس کے بعد بھی یہ خیال اس کے دماغ سے کبھی نہ گیا۔

جب ہندہ کا خوف و استعجاب کسی قدر رفع ہوا تو اس نے اپنے سامنے مردانہ حسن و شباب کی ایک تمثال کو سر تسلیم خم کئے ہوئے دیکھا اور اس مداخلتِ بیجا کی وجہ دریافت کی، لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ وہ ایک سپاہی تھا، محل کے قریب سے گذر رہا تھا کہ ہندہ کا نغمۂ موسیقی اُسے کھینچ لایا۔ ہندہ بجائے خود اس قدر محو شوق ہو چکی تھی کہ اس سے زیادہ دریافت کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔

اگرچہ تبادلۂ الفاظ ہوتا رہا لیکن ہندہ کے دل میں بار بار یہ خیال گذرتا تھا کہ یہ شخص انسان نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اندیشہ مند تھی کہ آج اس کی روح کسی ایسی ہستی کے قبضہ و اقتدار میں ہوئی چلی جا رہی ہے جو کسی قصور کی پاداش میں فردوس سے جلا وطن کر دی گئی ہے۔ کاش اس وقت کوئی ہندہ کے کان میں اتنا کہہ سکتا کہ اے پیکر شوق و محبت غم نہ کھا اور اپنے لطف و مسرت کو اندیشہ کی تلخی سے آزردہ نہ کر، تیرا عاشق نہ تو کوئی جن ہے اور نہ کوئی آوارہ وطن فرشتہ۔ وہ ابن آدم ہے جو تیری سادگی شباب کی پرستش کرتا ہے اسی جوش و عقیدت کے ساتھ جس استقلال و جرات میں وہ اپنی تلوار اٹھاتا ہے، اس کا دل دنیا کے بہترین دلوں میں سے ایک ہے جس کی حرارت کی لہریں دن کے دیوتا (آفتاب) کی ذی حیات شعاعوں کی طرح کام کرتی ہیں۔

آج کی شب اس گمنام عاشق کا جوش شوق ایک قسم کی افسردگی سے مملو ہے، اس کے چہرے پر خفیف سی زردی چھائی ہوئی ہے اور اس کی بھویں ڈھلی ہوئی ہیں، اس سے قبل ہندہ نے اس کو اتنی پریشان حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اسی غیر معمولی حالت کے باعث دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔

ہندہ نے اس خوف سے کہ مبادا حقیقتِ حال کا علم اس کی مسرتوں کو برباد نہ کر دے اپنے

خیالات بھلا دیئے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت خود اپنی آواز سے بھی خوف کھا رہی ہے، تاہم کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگی" دیکھتے ہو، چاند کی کرنوں کا تبسم کس درجہ شیریں ہے، میں اپنے تخیل کی بعض ساعتوں میں اکثر تمنا کرنے لگتی ہوں کہ اس سامنے والے چھوٹے سے جزیرے کے بڑے رنگ جاتے اور ہم۔ صرف تم اور میں۔ اُسکے باغوں کی تنہا آبادی ہوتے اور کسی غیر معلوم سمندر کی سمت اُڑ جاتے، جہاں کی نبض کو حرکت نہ ہوتی، مگر ہماری اور جہاں ہم دونوں محبت کی زندگی بسر کرکے تمام جاتے، جہاں ہم اس کلفت زار دنیا کی بیرحمیوں اور سرد مہریوں کی زد سے دور ہوتے اور جہاں ہم کو کوئی نہ دیکھ سکتا، مگر فرشتوں کی متجلی آنکھیں، ہماری یہ نرالی جنت مکروہات عالم سے یکسر پاک ہوتی، کیا تم ایسی زندگی کو پسند کرتے ہ؟" یہ کہہ کر وہ ایک تبسم شوخ کے ساتھ اسکی جانب مڑی مگر اس کا یہ تبسم قایم نہ رہا اور اُس کی اُداسی کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اُس نے دیکھا کہ اس کے عاشق کی نگاہیں سخت متالم اور غمگین ہیں۔ اندیشہ و خطرات سے دل تو پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا اس حالت کو دیکھتے ہی ہندہ کی آنکھوں سے گرم گرم قطرات اشک جاری ہو گئے۔

"میں سمجھتی تھی" ہندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" یہ میرا ہر گھڑی کا خوف، میرے اندیشہ ناک خواب ضرور رنگ لائیں گے۔ میں سمجھتی تھی، جانتی تھی کہ اس حالت کو دوام نہیں ہو سکتا" اس عاشق بے نام و نشاں نے منہ سے کوئی لفظ کہے بغیر، اپنا ہاتھ ہندہ کے شانے پر رکھ کر اُسے تسلی دینا چاہی، مگر ہندہ کے جذبات میں اس سے اور ہیجان ہوا اور وہ جوش گریہ کے ساتھ کہتی رہی" میں نے جب کبھی کسی پودے یا کسی پھول کو پیار کیا ہے، سب سے پہلے وہی کملایا ہے اور جب کسی ہرن کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پرورش کیا ہے سب سے پہلے قضا نے اُسی کو اپنا نشانہ بنایا ہے، مگر آہ! میری محبوب ترین تمناؤں کی بربادی اس سے زیادہ المناک کبھی نہ ہوئی تھی جیسی آج ہونے والی ہے۔ میری موجودہ مسرتیں، میرا یقین ہے، کہ نہ صرف میری گذشتہ شادمانیوں پر فوقیت رکھتی ہیں بلکہ میں تو باور کئے ہوئے تھی کہ اگر جنت میں کوئی سرور انسان کو ملنے والا ہے تو وہ اس سے شیریں تر نہ ہوگا۔ میری تمنا تو صرف اتنی تھی کہ تمہیں ایک نظر دیکھ لیا کروں، اگر نہ دیکھ سکوں تو تمہاری آواز ہی سُن لیا کروں گیا میرا یہ یقین کہ تم، مجھ سے چھین لئے جاؤ گے"...... اجنبی ہندہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے، اور تھوڑی دیر بعد جب تموج گریہ کم ہوتا ہے تو ہندہ پھر اس کی طرف دیکھکر کہنے لگتی ہے" مگر نہیں ہمارا جدا ہو جانا ہی بہتر ہے، ہماری یہ ملاقاتیں تباہی کی بنیادوں پر قایم ہیں، گو میں واقف ہوں کہ مجھ تک پہنچنے میں جان کا اندیشہ بھی تمہیں پیارا ہے، مگر خدا حافظ! میری بہترین خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔

اپنی حالتِ یاس والم میں بھی اس خیال سے کہ تم مجھ سے دور ہو، مگر محفوظ و مطمئن، خوش رہونگی۔ آفتاب کی شعاعوں اور ماہتاب کی کرنوں کو دیکھتی رہونگی کہ وہ اپنی حرارت و روشنی سے تمہاری راحت کا باعث ہونگی، ہاں میں مفارقت میں اپنی جان دیدینا پسند کرونگی، لیکن تمہیں خطرہ میں دیکھنا گوارا نہیں کرسکتی۔

”خطرہ“ ہندہ کو اپنے آغوش میں تنگ تر لیتے ہوئے اُس نے جواب دیا ”میری پیاری، مجھے ایسے الفاظ کہنے پر مجبور نہ کر، جس میں افتخار و غرور کا شائبہ بھی پایا جائے، کیونکہ مجھے تو دنیا میں اب سوائے تیری محبت کے حصول کے کسی چیز پر بھی فخر نہیں ہوسکتا، کاش تجھے علم ہوتا کہ تیرا جاں نثار، جس نے خطرہ ہی کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے کیا کچھ نہیں کرسکتا اور کیا کچھ نہیں کرچکا ہے۔ جس شخص کے کانوں میں ہر لحظہ موت کی صدا آتی رہتی ہے اور جس کی تلوار بحالتِ خواب بھی اس کا تکیہ رہتی ہے، اُس کے لئے خوف و خطر ایسے لفظ ہیں جو اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتے اور مخصوص اُس صورت میں جبکہ تیرا خیریں وجود اس خطرہ کا باعث ہو۔ میری پیاری مجھ سے کہہ کہ تو کسی وجہ سے خوف زدہ نہیں ہے، مجھے اپنے پاس آنے سے منع نہ کر، ہاں کہدے کہ ہم اسی طرح ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے اور ہمیشہ ملتے رہیں گے، تیرے فراق کا خیال مجھے بزدل بنائے دیتا ہے۔“

اُس کے اس پُرملال اظہارِ جذبات سے، جس سے شجاعانہ غیرت ٹپک رہی تھی، جس کے باعث اُس کے لہجہ میں ایک غیر محسوس درشتی پیدا ہوگئی تھی اور جس کا احساس صرف اس کا لبریزِ شوق دل ہی کرسکتا تھا، ہندہ کو سہما سا دیا اور گو وہ سوائے ایک نگاہِ مایوس و مسترحم ڈالنے کے کچھ نہ کہہ سکتی تھی، تاہم وہ اپنی حالت سنبھالتی اور کہتی ہے ”مجھ سے خفا نہ ہو، اس نیلے آسمان کے سایہ میں ہندہ کو کسی چیز سے خوف نہیں، مگر تمہاری ان آنکھوں سے، ان نگاہوں سے جو مجھے اس وقت ڈرا رہی ہیں۔ زمین کے پردے پر اگر میرے دل کو کوئی شے مسحور کرسکتی ہے، مجھے اس راستہ سے بھٹکا سکتی ہے، اگر کوئی چیز میری روح کو اس کے پیمانِ غیر معلوم سے ہٹا سکتی ہے تو وہ تمہاری ایک نگاہ ہے۔ مگر نہیں، میں پھر خود غرض ہوئی جاتی ہوں، میری قسمت تو مقرر ہو چکی ہے، میری تقدیر کا خوفناک فیصلہ تو ہو چکا ہے اور اب قبر سے پہلے میں تم سے نہیں مل سکتی، لیکن آہ اس راز کو کون حل کرسکتا ہے کہ جن دو روحوں کو تقدیر ایک کردے دنیا اُس کے اتصال کو کیوں منع کرتی ہے؟“

اجنبی :۔ ”اے عرب کے چاند! اگرچہ یہ اعتراف میرے لئے کتنا ہی روح فرسا کیوں نہ ہو، لیکن

مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے، جس کو ہماری محبتوں کی صداقت بھی عبور نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری باہمی محبت فطرت کی سخت ترین ستم ظریفیوں میں سے ہے، کیونکہ قومِ عرب سے میرے معاشری تعلقات اسی صورت میں قایم ہو سکتے ہیں جبکہ تاریکی و نور کی طاقتیں آپس میں متصل ہو جائیں، تیرا باپ ۔۔"

"پاک اللہ، اس کے ضعیف جان کی حفاظت کرے!" ہندہ مضطربانہ طور پر اُس کا قطع کلام کر کے اور یہ معلوم کر کے کہ اس کا عاشق، خود اُس کے باپ کی فوج کا سپاہی نہیں ہے، کہتی ہے "تم اُس سے واقف نہیں ہو میں سمجھی۔ تم اس کی فوج کے سپاہی نہیں ہو، مگر وہ تو شجاعت کا شیدا ہے اس وسیع آسمان کے نیچے میرے باپ سے زیادہ بہادر کی قدر کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں جب میں اس کے چمکیلے خنجر اور تلوار سے کھیلا کرتی تھی، تو مجھے اسکا بہ قسم یہ کہنا یاد ہے کہ یہ لڑکی کسی بہادر سپاہی کی دلہن بنے گی۔ اب بھی جب کبھی میں اس کے لئے ٹھنڈا شربت اور خوشبودار پھول لیکر جاتی ہوں تو کہا کرتا ہے کہ نا کتخدا لڑکیوں کا میدانِ جنگ میں محبت کیا جانا اور نعرہ ہائے نصرت و فتح مندی میں بیاہا جانا، بہترین طریق عروسی ہے، میرے پیارے، کیوں تم میرے والد کی فوج میں شامل نہیں ہو جاتے ؟ تم دیکھتے ہو کہ ان ایرانیوں نے کیسا سر اُٹھایا ہے" ہندہ نگاہ اُٹھاتی ہے تو اسکا چہرہ غم و غصہ سے دمکتا ہوا دیکھکر یہ سمجھتی ہے کہ اس کا یہ طیش و غیض ایرانیوں پر ہے جن کے متعلق خود ہندہ نے اپنی گفتگو میں اشارہ کیا تھا، وہ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتی ہے "تم اس وقت ایک سچے اور بہادر سپاہی کی طرح غضبناک ہو رہے ہو۔ بس تو صبحدم تم میرے باپ کی فوج میں شریک ہو جاؤ اور جب دشمنوں کے مقابلے کے لئے تلواریں بلند ہوں تو بھول نہ جانا کہ محبت کا دیوتا اور تمہاری ہندہ اُن تلواروں کے سایہ میں کانپ رہے ہوں گے اور جب تم ان پرستارانِ آتش، ان بے دین گبروں پر، جن سے میرے والد کی دشمنی ہے فتحیاب ہو۔۔"

"بس، ہندہ بس" اُس کی غیور طبیعت کے لئے عزتِ قومی کی توہین ناقابلِ برداشت تھی۔ ہر چند کہ وہ ہندہ کی ہر ہر ادا کا والہ و شیدا تھا اور نہ چاہتا تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ آزردہ ہو، مگر اس وقت اس کے جذبات حد و ضبط کو طے کر گئے اور وہ بے اختیارانہ دامنِ قبا کو کھوتے ہوئے کہنے لگا "تیرے یہ الفاظ جو میرے لئے آبحیات کا اثر رکھتے ہیں اس وقت موت کی تلخی معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چند تیرا ملال بھی

میرے لئے جانگزا ہے مگر جن حالات کا علم تیرے لئے ناگزیر ہے وہ کیوں پردۂ خفا میں رکھے جائیں۔ دیکھ اور افسوس کر کہ میں گبر ہوں اور جس قوم کا نام ہی تیرے باپ کے جذباتِ نفرت کو برانگیختہ کر دیتا ہے، میں اُسی قوم کا ایک فرد ہوں۔ اُسی قوم مشرکین، اُنہی غلامانِ آتش میں سے ہوں جو صبح و مسا اپنے کردگار کے گھر میں آسمانوں کی روشنیوں کے سایہ میں اس کی عبادت کرتے ہیں، میں اُنہیں خانماں برباد ایرانیوں میں سے ہوں جو اپنے وطنِ مقدس کی ذلت کا انتقام لینے کے لئے زندہ ہیں۔ ہندہ شاہد رہ میرے حلف کی جو میں یزدان کی منور آنکھوں کے حضور اٹھاتا ہوں، کہ یا تو میں ایران کو غاصبوں کی غلامی سے آزاد دیکھونگا یا موت کی آغوش میں سو جاؤنگا۔ تیرا باپ —— ہیں، تو کانپ رہی ہے! نہیں نہیں تو اطمینان رکھ کہ جو ہستی دنیا کو تیرے وجود کی روشنی و رنگینی سے زینت دینے کا باعث ہو، وہ میرے لئے اتنی ہی مقدس و قابلِ احترام ہے، جس قدر کہ وہ پاک جگہ جہاں آگ کی پرستش کی جاتی ہے۔ آہ وہ پہلی رات، جس رات میں اپنی کشتی پر اس محل کیطرف آیا تھا، میں نے جس شکار کی تلاش میں اس صعوبتِ راہ کو گوارا کیا تھا وہ حسن تھا میں درخت پر اس لئے چڑھا تھا کہ باز کو اس کے گھونسلے میں گرفتار کروں، مگر میں نے وہاں ایک مرتعش فاختہ کو پایا اور اب تو میں خود ایک صید ہوں صید مجروح! اور صحیح معنوں میں نصرت تیرا ہی حصہ ہے۔"

یہ وقت ہے کہ دو دل، جن کی حرکت ایک تھی، دو دماغ، جن کی طاقت ایک تھی، جداگانہ احساسات و خیالات کا آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ہندہ اس غیر متوقع انکشافِ حقیقت سے ایک تصویرِ غم ایک پیکرِ تحیر بن گئی ہے، اس کے آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ دوسری جانب ایرانی ہیرو ایک ہی وقت میں دو مختلف جذبات کا معمول ہے۔ ہندہ کو اس نے اپنے آغوش میں لے لیا ہے، اور جانتا ہے کہ ہندہ کے دل کو کیا کچھ صدمہ نہ پہونچا ہوگا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، اُس نے ہندہ کو اپنی آغوشِ تنگ میں کھینچکر کہا "ہندہ! کاش ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ ملے ہوتے، یا کاش تو ایک ایرانی دوشیزہ ہوتی اور ہم دونوں انہیں وادیوں میں پھرا کرتے، انہیں کھیتوں میں ہمارے ایامِ طفلی بسر ہوتے، ایک ہی منور شعلہ کے حضور ہم دونوں سجدہ ریز ہوا کرتے، اور تعلقات ہی پیار کی وہ گرہیں، جنکے اندر وطن کی دلکشیاں پنہاں ہوتی ہیں، ہم دونوں کو باہم گروابستہ رکھتیں، یہاں تک کہ ایران کا ادنیٰ حرف انگیز نغمہ ہوتا، میں تیری موسیقی کے نغموں میں گذری ہوئی ساعتوں کے ترانے سنتا، تیرا تبسم یزدانی مجھے عیش و عظمتِ گذشتہ کی یاد دلاتیں اور فارس کی پامال روح، تیرے وجود میں حیات گزیں ہوتی۔

آہ، اگر ایسا ہوتا تو وہ کون سی تلوار تھی جو نیام کے اندر رہ سکتی اور کون تھا جو صمصام بے پناہ کے مقابلہ میں آسکتا جس کی ہر ہر چمک پر ہزاروں فتحمند یاں قربان ہو اکرتیں! قسمت کی یہ ستم ظریفی دیدنی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے اس قدر علیحدہ، اس درجہ بعید ہیں کہ شائد قدرت اس سے زیادہ اجنبیت پیدا کر ہی نہیں سکتی، تاہم محبت کی سخت ترین بندشوں نے ہمیں کتنا قریب کر دیا ہے۔" ہندہ اپنے محبوب کی تقریر میں کبھی تو شکار یہ مایوسی ہوتی جارہی تھی اور کبھی امید کی ایک خفیف سی جھلک اس کے چہرہ کو دمکا دیتی تھی، مگر اتنی مجال نہ تھی کہ خود بھی کچھ کہے۔ چنانچہ وہ کہتا رہا اور یہ سنتی رہی "اگر میں مذہب، وطن اور احباب سے روگردانی اختیار کروں اُن سے بیوفائی گوارہ کروں، تو اپنی محبت کی صداقت قایم کر سکتا ہوں۔ تیرے باپ کو میرے وطن سے کینہ ہے، فطرتاً تجھے بھی اس ملک سے نفرت ہونی چاہئے۔ اس وقت بھی کوئی عجب نہیں کہ تیرا سینۂ صاف اس کینہ سے لبریز ہو لیکن نہیں میرا خیال غلط ہے، نفرت و کینہ اتنے حسین ہو ہی نہیں سکتے۔ ناممکن ہے کہ یہ پست و ذلیل جذبات تیرے دل میں جگہ پا سکیں۔ جو ہستی تیرے لئے ہر چیز کو بھلا دے سکتی ہے، فراموش کر دے سکتی ہے اس کی خاطر، اس کی محبت کے واسطے اس کا وطن تجھے بھی اتنا ہی محبوب و مقدس ہونا چاہئے۔ دیکھ سامنے جو وسیع مرغزار ہیں، اور اُن میں جو آبادی نظر آرہی ہے۔" ہندہ کے بلوریں شانے پر ہاتھ رکھ کر وہ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتا ہے "یہ سب فرزندانِ وطن کے خون کا نوحہ اپنی زبان سے بیان کر رہے ہیں، آہ اس وقت بھی جبکہ ایران کے فدائیانِ وطن کے خون، اس کی بیواؤں کی سوگواریوں اور اس کے یتیموں کی نالہ وزاریوں کے لئے دنیا کی آنکھیں خشک اور بے حس ہونگی، اس وقت بھی وہاں ایک دل ہوگا، جسکے اندر اس تباہی کا درد ہوگا ایک آنکھ ہوگی جو اس بربادی پر آنسو بہائیگی، میری پیاری ہندہ وہ دل تیرا دل ہوگا اور وہ آنکھ تیری آنکھ ہوگی! ناممکن ہے کہ تجھے میرے وفورِ محبت کا احساس نہ ہو اور وہ احساس تجھے جذبۂ ترحم سے لبریز نہ کر دے۔"

دفعتہً خلیج کی نیلگوں سطح پر ایک روشنی نظر آئی، جس نے اُسے کچھ مضطرب سا کر دیا، روشنی کا یہ شعلہ کئی مرتبہ اُٹھ اُٹھ کر گم ہو گیا، گویا وہ کسی ملاح کا جھلملاتا ہوا چراغ تھا، یا اُن ستاروں میں سے ایک تھا جو ہر شب تو آسمان سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتے تھے، لیکن آج زمین سے آسمان کی طرف جا رہے ہیں۔ اس نے ہندہ سے روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میری پیغامبر ساں روشنی ہے، مجھے اب جانا چاہئے، میرے ایک لمحہ کا مزید قیام ہم دونوں کی تباہی کا موجب ہوگا۔ خدا حافظ میری شیرینئ حیات، الوداع!"

ہندہ فرطِ شوق میں اس سے لپٹ جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس سے جدا ہو۔ مگر اجنبی کہتا ہے۔ "اے ہندہ، میری روح، اس عارضی جنت کے لئے جو تیری معیت میں مجھے حاصل ہے، میں بہشتِ دوام سے بھی کچھ زیادہ عزیز چیز کی قربانی گوارا کرنے پر طیار ہوں، مگر افسوس کہ فرضِ وطن مجھے پکارتا ہے اور اس فرض کی سبکدوش ہونیکے بعد میں تیری مرضی کا غلام ہوں۔" یہ کہتا ہوا ہندہ سے وہ ہاتھ چھڑا کر چلدیتا ہے۔

وہ اس وقت گویا محبت سے بھاگ رہا ہے اور موت کی طرف بھاگ رہا ہے، وہ چلا جاتا ہے اور ہندہ ششدر وحیران کھڑی رہ جاتی ہے۔ اس کے آنے سے، جس چہرہ پر معلوم ہوتا تھا کہ خندہ ماہتاب نے استقلال حاصل کیا ہے، اس وقت نظر آرہا ہے کہ دنیا بھر کی زردی اس صورت میں بھر دی گئی ہے، ہندہ کے اس طلسمِ سکوت وحیرت کو پتواروں کی آواز نے توڑا اور وہ ایک چیخ کے ساتھ غرفہ کی جانب یہ کہتی ہوئی جھپٹی "میں بھی آتی ہوں، میں بھی آتی ہوں، موت کی وادی میں میں بھی تیرے پہلو میں سوؤنگی اور موت کا سرد ہاتھ ہی ہمارے عقد کی گرہ باندھے گا۔ ہاں ہاں امواجِ بحر کے سرد بستر سے، جس پر میرا محبوب استراحت گزیں ہو، مجھے کسی بہتر بستر کی تمنا نہیں، ایک مشترک مرگِ آبی دنیا کی مسرتوں سے کہیں زیادہ شیریں تر ہے، اس حالت سے کہ میں زندہ رہوں اور تنہا۔"

آہ۔ مگر ان دونوں کی آرزوئے مرگ ابھی قبل از وقت تھی، ہندہ کشتی کو جاتے ہوئے دیر تک دیکھتی رہتی ہے اور آخرکار کشتی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور ہندہ مایوس و مضطرب اپنے بستر پر جا پڑتی ہے۔

۴

آفرینش بیدار ہوئی اور صبح نے بھی ایک دلفریب انگڑائی کے ساتھ آنکھیں کھول دیں، سہانی صبح کی مائل بزردی روشنی نے نیلگوں سمندر پر متبسم ہوکر بحرین کے نخلستان اور عنبر بیز تاکستانوں کو نمایاں کر دیا بحیرۂ عرب کے ساحل، فصلِ تاک کی تازہ خوشبو سے بسے ہوئے ہیں، اور بحرِ ہند کی ہوائیں چکر لگا لگا کر پانی کی موجوں کو بلند کر رہی ہیں۔

افقِ مشرق سے آفتاب نے اپنے شعلہ رنگ شہپروں کو جنبش دی، یہ اُس وقت ہے کہ آسمانوں نے اپنا سفر شروع کیا، اُس وقت سے کہ فرشتۂ تجلی (خورشید جہاں تاب) نے سب سے پہلے اپنے خالق کے آتشیں نقوشِ قدم پر گام فرسائی اختیار کی، یہ وقت اس کے لئے کبھی نہیں آیا۔ آج یہ کرۂ آتش، اپنی تمام عظمت آفرینی کے ساتھ اُس وقت کو نہیں پاتا جبکہ ایران کے ہر ہر ذرہ کی آنکھیں اس کے تابناک چہرے پر جمی

ہوئی اپنی پرستش پیش کیا کرتی تھیں۔ وہ آج اُس زمانہ کو ڈھونڈھتا ہے جبکہ بند میر کے کناروں سے لیکر سمرقند کی کنہائی باغ تک ملک کا ہر گوشہ آتشکدوں سے آباد تھا اور بلند ہونے والے شعلوں کی شکل میں عبادت گذاروں کے جذبات نیاز آگیں اس تک پہنچتے تھے۔

اے یکسر شعلۂ ناز! کون ہے جو تجھے بتا سکے کہ تیرے پرستار کیا ہوئے، کون ہے جو تجھے پتہ دے سکے کہ تیری پرستش گاہیں کہاں گئیں، ہاں کیڈیسیا کے خون آلود میدان، اور ان آتشکدوں کے برباد شدہ آثار ضرور اس داستانِ الم کو دُہرا سکیں گے کہ بیدرد دشمن نے ایران کے پامال تاج کے جواہرات کس طرح توڑے اور فارس کے مذہب کو کس طرح اس نے سرد کیا، یا پھر وہ خانماں برباد کچھ بتا سکیں گے جو بحر قزوین کے محفوظ پھاٹکوں سے نکل کر کسی اجنبی سمندر کے کناروں پر کوہ موسین کی دامنوں میں پناہ گزیں ہیں۔

ایران کی عزت ملی بکلی زائل نہیں ہو چکی ہے اور گو متھرا کے غاروں سے بلند ہونیوالے شعلے سرد ہو گئے ہیں، تاہم ایسے فرزندانِ وطن ہنوز موجود ہیں، جن کے دل میں پوری طاقت کے ساتھ جذبۂ انتقام کا تخم بویا جا رہا ہے۔

ہمارا ہیرو، جس نے قصرِ امارت تک پہونچ سکنے کی دشواری کو سہل کر لیا تھا اور بہ آسانی امیر کی خوابگاہ میں داخل ہو کر حسن کے سینہ پر اپنا گھٹنا ٹیک کر ثابت کر دیسکتا تھا کہ گو ایک فاتح آرام کی نیند سو سکتا ہے لیکن وہ ایک شیدائے وطن کی گرفت سے قلعہ میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، اُن چند ایرانی نفوس میں سے تھا جو عربوں کی نسل سے متنفر تھے اور وطن کے لئے جان دیدینا پسند کرتے تھے۔

یہ سواحلِ بحر اخضر کے ایک دور افتادہ گوشہ میں پناہ گزیں تھا اور علاقہ کرمان کی نسل کا ایک پہاڑی دستہ اس کے ساتھ تھا۔ اس قوم کی جاں نثاریوں اور شہامتوں کی روایات فارس میں ضرب المثل ہیں، یہ لوگ اپنے قدیم مذہب پر اسی صداقت کے ساتھ فدا ہو جانیکے لئے آمادہ رہتے ہیں جس صداقت کے ساتھ ان کا خدائے خاور اپنی نیم باز آنکھوں سے کوہستانِ فارس کے یخ بستہ چوٹیوں پر اپنی آخری شعاعیں اب بھی نازل کرتا رہتا ہے۔

اس کا نام اگر دوستوں کے دلوں میں عظمت و محبت کے جذبات ابھارنے والا تھا تو دشمنوں کے لئے وہ خوف و ہراس کا مترادف تھا۔ عرب آبادی میں اس کا نام غصہ و نفرت کے جذبات کو یکسر برانگیختہ کر دینے والا تھا، اور تمام آمادۂ بغاوت ایرانیوں میں وہ انتہا درجہ کا ملعون و خوفناک سمجھا گیا تھا، یہاں تک کہ بعض لوگ

اس کو ساحر کہتے تھے اور بعض کا خیال تھا کہ جنوں کا بادشاہ اس کی مدد کرتا ہے۔

ہر چند کہ وہ اتنا ہی جری اور بہادر تھا، جتنا ایک انسان کے لئے ہونا ممکن ہے، لیکن جس چیز نے اُس کے کارناموں کو مافوق الفطرت بنا دیا تھا، اس کے عزائم کو سحر آگیں کر دیا تھا وہ صرف ارض وطن کے ساتھ اُس کا جذبۂ عشق تھا۔ اسی کا اثر تھا کہ وہ مشکل سے مشکل حالت میں بھی سر بکف اور ہر لحظہ جاں نثاری پر آمادہ نظر آتا تھا، اس کا سحر اس کی تلوار تھی، جس پر قوم پرستی کا پانی چڑھا ہوا تھا اور اس کا افسوں "حریت" کا لفظ تھا جو اسکی زبان کا وظیفہ تھا۔

بلاشبہ وہ ایسے دودمان سے تھا، جس میں بہت سے ہیرو پیدا ہوے، جن کی سپہ گری کی روایات اور بہادری کی داستانیں آفتاب کے شعاعوں کی طرح روشن تھیں اور جن کے کارناموں نے اس خاندان کے خون کو ایسا مقدس بنا دیا تھا، جیسا لبنان کے چھوٹے چشمے کے کناروں پر صنوبر کے درختوں کی قطار نے اس کے پانی کو برگزیدہ بنا دیا ہے۔

اس وقت ایران کی روح ہر چند غمناک تھی، مگر اپنے ماضی کی جلال و عظمت کے افسانوں سے معمور و آباد چنانچہ اس ہیرو کے دل و دماغ نے اُسی صولت و شوکت کے گہوارے میں تربیت پائی تھی اور گو اس کے دل و دماغ کا اُٹھان، اس کے جذبات و حسیات کی پرواز، فارس کے آسودہ ترین ماضی کے لئے موزوں و مناسب تر تھی، مگر منشار فطرت تو یہ تھا کہ وہ زمانہ اشک و غم میں پیدا ہو، پھر ایسی ہستی کے لئے، جس کی اُفتاد طبع یہ ہو سر تسلیم خم کر دینا کیونکر گوارا ہو سکتا تھا، مغلوبیت کی ذلت اس کی شرافت قومی کے احساس کے لئے بہت زیادہ سخت تھی اور اس لئے کہ وہ وطن محبوب کا تماشائے ذلت نہ دیکھے، ایک گمنام گوشہ میں جا چھپا تھا کہ اطمینان سے صورتِ انتقام پیدا کرے، مگر فرزندانِ وطن کی آنکھوں سے ٹپکنے والے اشک غم کے قطرے اُس کے قلب طپاں پر آتشِ سیال بن کر گرے اور وہ بیقرار ہو کر باہر نکل آیا۔

تاہم اس میں شک نہیں کہ حسن کی عظیم قوتوں کے مقابلہ میں کرمانی جرأت و شہامت کا بروئے کار آنا دشوار تھا اور آخر کار یہی ہوا کہ فدائیانِ ایران دشمن کے عظیم الشان حملوں کی تاب نہ لا سکے اور غنیم کی بے پناہ و بے تعداد فوج نے سرزمین ایران کے ساتھ وہی کیا جو ٹڈی دل فصل خرما کے ساتھ کرتا ہے۔

(باقی)

ل - احمد

فلسفۂ نیٹشے پر اک نظر

یورپ کی اس جنگِ عظیم سے، جو جو انکشافاتِ ہائلہ دنیا میں ہوئے ہیں، وہ اس قدر حیرتناک ہیں کہ ایک انسان مشکل سے باور کر سکتا ہے، کہ عقولِ انسانی اس عہدِ تمدن وتہذیب میں بھی اس قدر درندگی کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ ازمنۂ تاریک کی یاد دل سے محو ہو جائے۔

اس وقت تک جرمنی کے اغراض ومقاصد پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ گو کیسی ہی بسیط وشفاف کیوں نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہنوز بہت سے پہلو ایسے ہیں جو تنقید کے محتاج ہیں اور اس وقت تک ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ میں نے نگار کے اشاعتِ اول میں تجارتی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بتایا تھا کہ جرمنی کس خیال کے زیرِ اثر میدانِ جنگ میں آیا، لیکن آج یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اسے میدانِ حرب تک پہنچا دینے میں، اور کن کن علمی ذرائع سے کام لیا گیا تھا۔

یہ ایک حقیقتِ مسلمہ ہے کہ جرمنی، علوم وفنون کا ملک ہے اور اس کی آبادی کا غالب حصہ ایک خاص انداز کے فلسفہ سے متاثر ہے، لیکن جس طرح "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہے"، اسی طرح جرمنی کی تمام فلسفہ طرازی بھی قابلِ تحسین نہیں ہو سکتی۔ اور علم وفضل کا یہی وہ تاریک پہلو ہے جسے نیٹشے اور ورٹشکی نے سرزمین جرمنی میں نمایاں کیا۔

نیٹشے کے اصول

نیٹشے ایک زمانہ دراز سے جرمنی کے سامنے اپنی تبلیغ پیش کر رہا تھا کہ جس طرح ممکن ہو دنیا میں ضعیف قوموں کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے، چنانچہ جرمنی کے سوادِ اعظم اور خاصکر فوجی لوگوں کا یہ اعتقاد ہو گیا کہ صرف جرمنی کا رہنے والا انسان ہی دنیا کا قوی اور ترقی یافتہ فرد ہے اور صرف اسی کو عالم میں باقی رہنے کا حق حاصل ہے، نیز جرمنی کے علاوہ دوسری قوموں کو فنا ہو جانا چاہیے، اور تنہا جرمنی تمدن کو (جس کی بنیاد اصول نیٹشے وغیرہ پر ہے) تمام اقوام کے تمدن پر غالب آ جانا چاہیے، یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ صرف جرمنی ہی تمام دنیا پر قبضہ کرنے اور اس پر حکومت کرنے کا مستحق ہے۔

جرمنی کی فوجی طاقت جو اصولِ مذکورہ سے متاثر ہو چکی تھی، جرمن حکومت پر غالب ہو گئی، یہانتک کہ ہر محکمہ کا انتظام خواہ وہ ملکی ہو یا فوجی، انہی لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا اور صرف فوجی افسر ہی جرمنی کے اربابِ حل وعقد

سمجھے جانے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی دوسری قوموں کا دشمن ہوگیا اور غیر اقوام کے مقابلہ میں اُس نے حق و انصاف کو بالکل چھوڑ دیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں جرمنی اپنے جن اصول پر دنیا کا دستور العمل قایم کرنا چاہتا تھا اگر وہ اُنمیں کامیاب ہو جاتا تو اُس کا اثر ہیئتِ اجتماعی پر کیا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ جرمنی سیاست اس صورت میں قوموں کو ذیل کی ترتیب میں رکھتی اور ہر طبقہ کے لئے خاص اجتماعی قوانین وضع کئے جاتے۔

۱۔ (Superman) یعنی انسان اعلیٰ۔ اس طبقہ میں صرف جرمن قوم کا شمار ہوتا اور اگر کوئی قوم اپنی خصوصیات کو چھوڑ کر جرمنی بن جاتی تو ممکن تھا کہ اس کا شمار بھی اسی طبقہ میں ہو سکتا۔

۲ (Ordinary man) یعنی انسان متوسط۔ اس میں جرمنی کے علاوہ اور متمدن اقوام کا شمار کیا جاتا۔

۳ (sub - man) یعنی انسان ادنیٰ۔ اس میں دنیا کی تمام غیر متمدن اور نیم وحشی اقوام داخل ہوتیں۔

انسان متوسط، انسان ادنیٰ کو فنا کرنے کی کوشش کرتا۔ اور انسان اعلیٰ، متوسط کو فنا کر دینا چاہتا، یہانتک کہ دنیا میں سوائے انسانِ اعلیٰ کے جو صرف جرمنی ہوتا اور کوئی باقی نہیں رہتا۔

جلتون اور نیٹشے بعض اجتماعیئین، خاص کر جلتون نے تحسین نسل کے مسئلہ پر بہت کچھ غور کیا تھا اور عقل و فزیالوجی دونوں حیثیتوں سے اس مقصد کے لئے چند علمی قواعد بھی وضع کئے تھے جو علم یوجینیہ Eugenice (علم تحسین نسل) کا سنگ بنیاد ہے لیکن جلتون اور نیٹشے کی تعلیمات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، علمائے تحسین نسل صرف یہ چاہتے ہیں کہ آیندہ نسلیں خوبصورت اور قوی پیدا ہوں بغیر اسکے کہ ضعیف افراد پر کوئی مضرت رساں اثر پڑے۔ لیکن نیٹشے چاہتا ہے کہ ضعیف افراد کو بالکل فنا کر دیا جائے اور دنیا میں صرف قوی افراد باقی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نیٹشے اپنے کو اس عالم میں بالاتر سمجھتا تھا اور مدبر عالم بھی خیال کرتا تھا۔

ڈارون کے اصول کی توہین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات نیٹشے اور اسکے متبعین نے ڈارون کے ناموس ارتقا سے حاصل کئے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ یہ ناموس دنیا کے تمام مظاہر فطرت پر منطبق کر دیا جائے۔

نیٹشے نے اس مسئلہ میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں قایم کیا۔ اسکا خیال ہے کہ جس طرح ایک بلی چوہے کو فنا کر دیتی ہے اسی طرح سفید رنگ کا انسان، سیاہ رنگ والے آدمی کو ہلاک کر دینے کا حق رکھتا ہے۔

نیٹشے نے یہ تو دیکھا کہ جب دو بلیاں ایک پارہ گوشت پر لڑتی ہیں تو قوی ضعیف سے چھین لیتی ہے لیکن اس نے اس پر غور نہیں کیا کہ شہد کی مکھیاں کس طرح متفقہ کوشش سے شہد فراہم کرتی ہیں۔ حیف۔

تنازع اور تعاون کا تعاقب | عالم حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تنازع اور تعاون دونوں ایک ساتھ اپنا عمل جاری کرتے ہیں لیکن انکے اثرات ہمیشہ متعاقب ہوتے ہیں یعنی جس وقت تعاون اپنا عمل کرتا ہے تو تنازع اسکے باطل کرنیکے لئے مستعد ہو جاتا ہے اور جب تنازع کے اثرات قوی ہو جاتے ہیں تو تعاون اسکو محو کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات فتح تعاون ہی کے حصہ میں آتی ہے۔

تنازع کا محل، متباین افراد میں زیادہ ہوتا ہے مثلاً بلی اور چوہا۔ ایک جنس کے افراد میں اس وقت تنازع ہوتا ہے، جب دونوں فرد ایک ہی مقصد حاصل کرنیکے لئے کوشش کرتے ہوں مثلاً بلیاں دو ہوں اور چوہا ایک، یا انہیں فطرت کی طرف سے یہ الہام ہو جائے کہ جن چوہوں کو وہ شکار کرنا چاہتی ہیں، تعداد میں کم ہیں۔

اسی طرح شہد کی مکھیوں کے درمیان بھی اس وقت تنازع ہو سکتا ہے جبکہ وہ شہد جمع نہ کرتی ہوں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا، کیونکہ فطرت نے انھیں یہ سبق دیا ہے کہ اگر وہ موسم بہار میں شہد کا ذخیرہ فراہم نہ کریں گی تو اس موسم میں (جب پھولوں میں شہد نہیں ہوتا) بھوک سے مر جائیں گی۔ شہد کی مکھیاں چونکہ ایک مقصد مشترک کے لئے بالاتفاق سعی کرتی ہیں اس لئے اُن میں تنازع نہیں پایا جاتا بلکہ حد درجہ تعاون موجود ہے اور تنافر و تباین سے دور ہو کر جسم واحد کی طرح اپنی حیات اجتماعی کا بقا چاہتی ہیں۔

کائنات عالم کے تمام اجزاء ”ناموس اجتماع“ کے اصول پر قائم ہیں یعنی جب یہ اجزاء تدریجاً جماعت کی صورت اختیار کرتے ہیں، اور چھوٹی بڑی جماعتوں میں ملنا چاہتی ہیں اس وقت ہئیت اجتماعی پیدا ہوتی ہے۔ مگر چونکہ اس منزل تک پہونچنے کے لئے تصادم ضروری ہے اس لئے افراد اور جماعت کی ارتقائی رفتار کے لئے تنازع اور تباین کا پے در پے آنا بھی ضروری ہے، یعنی اجتماع اجزاء سے پہلے دفع و جذب کی صورت میں تنازع ہوتا ہے جس سے اجزاء کے درمیان توازن اور تناسب پیدا ہو کر اجتماعی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ عام قاعدہ ہے جو فطرت کے تمام مظاہر میں پایا جاتا ہے۔ مادہ سدیمیہ، اجرام سماوی، قشر الارض، جمادات بسیط و مرکب، خصائل نباتی، عائلات حیوانی، اجناس بشری، قبائل، اقوام، حکومتیں غرض سب میں یکساں طریقہ پر اسکا عمل جاری ہے۔

تعاون، تنازع کی جگہ | اس مختصر بیان کے بعد کسی عاقل کو شک نہیں ہو سکتا کہ نیٹشے اور اس کے اعوان و انصار کے اصول، قانون اجتماع بشری کے بالکل منافی ہیں، کیونکہ اگر اصول مذکورہ پر آزادی سے عمل ہونے لگے تو تعاون دنیا سے بالکل مفقود ہو جائے اور معمورہ عالم ایک دائمی تنازع کا میدان بن جائے۔

کائنات عالم کی رفتار ارتقائی یا اتحاد اجزاء میں، اجتماع بشری، سب سے آخری قدم ہے۔ جہاں تعاون انسانی، تنازع حیوانی کے قائم مقام ہو گیا ہے اگر یہ تعاون نہ ہوتا تو نہ جنس بشری میں ہئیت اجتماعیہ پائی جاتی

اور نہ اُن وحشی درندوں سے اُسے کچھ امتیاز حاصل ہوتا جو ایک دوسرے کو فنا کرتے رہتے ہیں۔

یہ مسلّم ہے کہ جنس بشری نے اس وقت تک تنازع نہیں چھوڑا ہے اور صحیح معنوں میں اسوقت تک اسکا تعاون پایا جاتا ہے۔ استعمار، تجارت اور نفوذِ سیاسی کے لئے اقوامِ عالم کے درمیان سلسلۂ تنازع برابر جاری ہے، بلکہ ایک ہی قوم اپنے اغراضِ اقتصادی اور سیاستِ داخلی کی بنا پر آپس میں تنازع کرتی رہتی ہے لیکن جنس بشری خاموشی کے ساتھ منازلِ ارتقاء کو طے کرنے سے بھی غافل نہیں ہے اور مستقبلِ بعید میں اک دن آنیوالا ہے جبکہ تعاون تنازع پر پوری طرح غالب آجائیگا اور اقوامِ عالم کے افراد میں روابطِ تعاون نہایت استحکام کے ساتھ قائم ہوکر، ہر قوم ایک ٹھوس جسم کی طرح ہوجائیگی۔

اصول نٹشے کا خطرناک اثر ہیئت اجتماعی پر

ہر حرکت و عمل جو نظامِ اجتماعی کے خلاف ہو وہ حقیقت میں مجتمع بشری کی بنیاد کو منہدم کرنیوالا ہے۔ اسلئے اگر نٹشے کے اصول پر افراد نے عمل شروع کردیا اور طاقتور ارباب نفوذ نے اپنی طاقت سے اسے رواج دینا چاہا تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہے کہ ہیئت اجتماعی کی وہ مستحکم عمارت منہدم ہوجائیگی، جسے ارتقائے بشری نے ہزاروں برس کی مدت میں طیار کیا ہے اور یہ خطرناک اصول، بشریت کو اس قدر پیچھے ہٹا دینگے کہ انسان اپنی حیاتِ اجتماعی کو چھوڑ کر بہیمی اور انفرادی طریقہ پر زندگی بسر کرنے لگے گا۔

نٹشے کے اصول خود متناقض ہیں

اصول نٹشے کی جو تاویل بھی کی جائے لیکن وہ ہرگز کسی معقول صورت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش نہیں کئے جاسکتے، کیونکہ :۔

۱۔ نٹشے نے ضعف اور قوت کے درمیان کوئی حد مقرر نہیں کی ہے اور نہ وہ مقرر کرسکتا ہے کیونکہ قوت و ضعف کے بیشمار مراتب لوگوں میں پائے جاتے ہیں، اگر ہر قوی کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے سے ضعیف کو فنا کردے تو یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہیگا، جبتک کہ تمام افراد فنا نہ ہوجائیں۔

۲۔ فرض کرلیجئے کہ نٹشے نے قوی اور ضعیف کے درمیان کوئی حد مقرر کردی تو کیا وہ افراد جنہیں نٹشے نے ضعفاء کی صف میں شمار کیا ہے اس پر راضی ہوسکتے ہیں کہ طاقتور افراد کی خاطر انہیں صفحۂ ہستی سے معدوم کردیا جائے لہذا وہ مجبوراً اُنکے خلاف آپس میں اتفاق کرلیں گے۔ اور چونکہ بعض وقت، قلت، کثرت پر غالب آجاتی ہے لہذا ممکن ہے کہ کسی وقت ضعیف لوگ غالب آکر اُنہیں فنا کردیں اور بجائے اسکے کہ مجتمع بشری ضعفاء سے خالی ہوجائے طاقتور لوگوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے جو مقصدِ نٹشے کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ اگر قوی کو ضعیف پر غالب آنیکے لئے ہر ایک طریقہ استعمال کرنیکی اجازت دیدیجائے، تو دنیا کا کوئی قانون باقی نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قوانین و شرائع لوگوں کے واجبات اور حقوق کی محافظ ہیں اور اگر وہ اُٹھا دیئے

جائیں تو ہیئت اجتماعی بالکل برباد ہو جائے، اور جب رعایت قوانین ضروری نہ ہوگی، تو جس طرح قوی اور ضعیف کے درمیان اس کی رعایت نہ ہوگی اسی طرح ایک قوی اور دوسرے قوی کے درمیان بھی اسکا احترام لازم نہ ہوگا۔ اور آخر میں یہی نتیجہ نکلیگا کہ ہیئت اجتماعی کے اجزاء پراگندہ ہو کر انسان، اجتماعی قیود سے آزاد ہو کر انفرادیت سابقہ کی طرف عود کر جائیگا۔

نٹشے کے اصول عہد حیوانی کے مناسب ہو سکتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ نٹشے نے اپنے اصول کی تعلیم اور اشاعت تو شروع کی لیکن اس نے انکے اجراء کے لئے کوئی دستور العمل تیار نہیں کیا، اس وجہ سے اُنکی تعلیمات صرف نظریات تک محدود رہتی ہیں، مگر یہ نظریات بھی غیر منتظم اور آپس میں متخالف و متناقض ہیں۔

نٹشے نے قوت کی تعریف کی ہے اور قوت حاصل کرنیکی ترغیب دی ہے اور ضعف کی مذمت کی ہے اور اُسے فنا کر دینا مناسب سمجھا ہے، ہم بھی قوت کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر فرد قوی ہو جائے اور ضعف کو برا خیال کرتے ہیں اور اسکے زائل کرنیکی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں چاہتے کہ ضعیف افراد محض اس قصور میں ہلاک کر دیئے جائیں کہ وہ ضعیف ہیں، کوئی عاقل بھی ایسے نظام کو پسند نہیں کر سکتا جس میں ضعیف افراد کو پامال کرنا ضروری ہو کیونکہ جو چیز عالم حیات میں ظاہر ہوئی ہے اُسے زندہ رہنے اور نفع اٹھانے کا پورا حق حاصل ہے

نٹشے کا مذہب اُسی وقت قابل عمل ہو سکتا تھا جبتک انسان نے ترقی کر کے اجتماعی صورت اختیار نہیں کی تھی بلکہ جانوروں کی طرح انفرادی زندگی بسر کرتا تھا، لیکن اب، جبکہ انسان ایک جسم اجتماعی ہو گیا ہے اور اُسکے مختلف اجزاء روابط اجتماعی سے جکڑے ہوئے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ طاقتور ضعیف سے تنازع کرے اور اُسے ہلاک کر دے کیونکہ اس صورت میں اس جسم واحد کے اجزاء منتشر ہو جائینگے اور حیات اجتماعی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

ضعف، ہیئت اجتماعی کا مرض ہے

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ضعف افراد، ہیئت اجتماعی کا ایک مرض ہے، لیکن اسکا علاج یہ نہیں ہے کہ اجزاء ضعیفہ قطع کر دیئے جائیں، بلکہ تدبیر یہ ہے کہ ضعیف کو قوی بنایا جائے۔

نٹشے جس غایت کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہی فطرت کا بھی مقصود ہے کیونکہ ہر آنیوالی نسل گذری ہوئی سے زیادہ اچھی ہوتی ہے اور رفتار ترقی برابر جاری رہتی ہے، فطرت بھی ضعیف کو معدوم کرتی اور قوی کو باقی رکھتی ہے، لیکن اس عمل میں وہ کبھی ضعیف پر ظلم نہیں کرتی اور نہ نٹشے کے اصول کو کام میں لاتی ہے۔

دنیا ہمیشہ ترقی کی طرف جا رہی ہے اور کائنات کے اجزائے مختلفہ آپس میں طرح متحد ہوتے جاتے ہیں، اور حیات اجتماعی کے ارکان مستحکم ہو رہے ہیں اور وہ بشریت کو سعادت کی طرف لیجا رہے ہیں۔ اسلئے اگر ہم مجتمع بشری کو ضعیف افراد سے خالی کرنا چاہیں تو اسکی تدبیر صرف یہ ہے کہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین اصول اختیار کئے جائیں اور انکی جسمانی و دماغی نشو و نما کی رعایت تمام کاموں پر مقدم سمجھیں۔

نیاز۔

طلوعِ آفتاب کی سرزمین

تاریخ عالم میں مشکل سے کوئی ملک ایسا نظر آئے گا، جو اپنی رفتارِ ترقی اور سکون آمیز انقلاب کے لحاظ سے جاپان کا نظیر قرار دیا جائے۔ ملک ترقی کرتے ہیں، قومیں عروج حاصل کرتی ہیں، لیکن اس طرح نہیں کہ صرف پچاس سال کی مدت میں، تہذیب و سیاست، علم و تمدن اور صنعت و اقتصاد کے تمام ان منازل کو طے کر لیا جائے جنکو طے کرنے میں ایک قوم کو صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

اگر نظر غایر سے دیکھا جائے، تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جاپان کی موجودہ تاریخ اُن عظیم الشان کارناموں کی تاریخ ہے، جو اک قوم کی صرف اجتماعی قوت ہی سے تکمیل کو پہنچتے ہیں اور جنکی مثال دنیا بہت کم پیش کرتی ہے، اس لئے اگر ہمارے سامنے دنیا کا کوئی ایسا نادر الوقوع معاملہ آجائے تو بہ حیثیت اک مُدرک انسان ہونیکے ہمارا فرض ہے کہ اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ کیا اسباب تھے، جنہوں نے نصف صدی کے اندر جاپان کو زمین سے اُٹھا کر ہمدوشِ ثریا کر دیا اور وہ کیا ذرائع تھے جنہوں نے اک گمنام جاہل اور وحشی قوم کو، دنیا کی نہایت زبردست متمدن اقوام کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا۔

جاپان کا رہبر اولین | تاریخ نے ہمیشہ اس حقیقت کو دُہرایا ہے کہ جب فطرت کسی قوم میں کوئی خوشگوار انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے تو وہ اس میں سے ایک مخصوص ہستی کا انتخاب کر لیتی ہے اور پھر اسی کو اپنا مظہر قرار دیکر، ساری قوم کا فیصلہ اسکے ہاتھ میں دیدیتی ہے، چنانچہ اسی اصول کے ماتحت، جاپان نے بھی جو عظمت حاصل کی ہے، وہ صرف مکاڈو موتسو ہیٹو کی صحتِ فکر کا نتیجہ ہے، جس نے صرف ۴۵ سال کے اندر (۱۸۶۷ء - ۱۹۱۲ء) ملک میں اُن اصلاحات کو مقبول بنا دیا کہ جاپان دفعتہً جاہلیت کا لباس اُتار کر، دنیا کی قابل ترین قوموں کی صف میں جگہ پانیکا مستحق ہو گیا۔

مکاڈو، بے انتہا ذہین اور علم دوست بادشاہ تھا اور مضطرب رہتا تھا کہ کیونکر جلد سے جلد اپنی قوم کو قدیم بندشوں سے نکال کر، تہذیب و تمدن کی جدید شاہراہ پر لگا دے، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہوا تھا، تو اسی وقت اس نے اک ایسا زبردست تاریخی خطبہ پڑھا تھا، کہ جب اس کی خبر مغربی ممالک میں پہنچی، تو یورپ کے ایوان سیاست میں زلزلہ پڑ گیا اور وہاں کی سفید آبادی، ایشیا کے اس "زرد خطرہ" سے رعشہ براندام ہو گئی۔

اس خطبہ کی حقیقی روح یہ تھی کہ اس میں شخصی اقتدار کے خلاف نہایت پُر زور دلائل پیش کئے گئے تھے

اور قوم کو اتفاق واتحاد اور اشتراک عمل کی دعوت دیکر نہ صرف دستوری حکومت کی طرف مائل کر دیا گیا، بلکہ اصلاح اعمال اور اشاعتِ علوم وفنون کو بھی قوم کا اولین فرض قرار دیا گیا تھا۔ پھر یہ سب کچھ زبانی پند ونصیحت نہ تھی بلکہ صدائے عمل تھی جو اسکے سینہ سے بلند ہو رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ آج یہ کہنے والا کل کچھ کرکے دکھا دینے والا ہے، اور آخر کار یہی ہوا کہ ۱۸۸۹ء میں خود اس نے اپنے ہاتھوں سے استبداد کا ملعون تاج سر سے اٹھا کر پھینک دیا اور اک عام دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ کیا دنیا کے بادشاہوں میں کوئی مثال ایسی مل سکتی ہے کہ کسی حکمراں نے خود شخصی اقتدار کو پامال کیا ہو؟

۱۸۸۹ء سے پہلے اسی مکاڈو کی سطوت وجبروت کا یہ عالم تھا کہ وہ مجالس میں کبھی بے نقاب ہو کر نہیں آتا تھا، کسی کپڑے کو دو بار نہیں پہنتا تھا، ایک سے زائد مرتبہ کسی برتن میں کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اس کے ملوکانہ جلال کی وجہ سے کوئی جاپانی فرزند آنکھ اٹھا کر اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ رعایا کی جان ومال کا مطلق العنان مالک سمجھا جاتا تھا، اور اک خدا کی طرح اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ لیکن اعلانِ دستوریت کے بعد ہی، اس نے ان تمام امتیازات کو یک لخت مٹا دیا اور ساری قوم کو اپنی حکومت میں شریک کر لیا، یہاں تک کہ ہر وہ شخص جو پہلے اس سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، اب اس کے ساتھ نہایت آزادی سے ہمکلام ہونے لگا۔

یہ تھا وہ انقلاب، جس نے نہایت قلیل مدت میں جاپان کو شخصی اقتدار سے نکال کر، دستوری حکومت کے برکات سے بہرہ مند کر دیا اور یہی تھا وہ انقلاب جو یورپ میں صدیوں کی کوشش اور ہزاروں آزادی پسند افراد کا خون بہانے کے بعد تکمیل تک پہونچا۔

تربیت وتعلیم

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کی ترقی کا مدار صرف حسنِ تربیت وترقی تعلیم پر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جاپان میں تعلیم وتربیت کا نظام مغربی سلطنتوں سے حاصل کیا گیا، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ ملک کی خصوصیات کے لحاظ سے اس میں بہت کچھ ترمیم وتعدیل بھی کی گئی۔

مکاڈو کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کوئی شخص جاپان کا جاہل نہ رہے اور یہ واقعہ ہے کہ اسکی یہ تمنا بڑی حد تک پوری ہوئی۔ اس وقت وہاں ۶ سال سے ۱۴ سال تک تعلیم جبری ہے اور فی صد دو آدمی بھی جاہل نہیں ہیں۔ اگر تم کسی جاپانی گانوں میں جاؤگے، تو دیکھوگے کہ وہاں ایک عمارت سب عمارتوں سے ممتاز وبلند ہے اور اس طرح تم بلا تامل پہچان سکوگے کہ گانوں کا مدرسہ کہاں ہے۔ وہاں صرف ابتدائی مدارس کی تعداد اس وقت چھبیس ہزار ہے، جس میں کالج اور یونیورسٹیاں شامل نہیں ہیں۔ ان مدارس میں ۱۲۶۵۰۰۰ استاد اور استانیاں درس دیتی ہیں۔

جاپان کے نظام تعلیم کا مقصود یہ نہیں ہے کہ مدارس کثرت سے تعمیر کر دیئے جائیں، بلکہ ملک میں اس روح کا پیدا کرنا ہے، جو اک ترقی کرنے والی قوم میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آج وہاں کا ہر فرد، ذاتی و شخصی مصالح کو فراموش کر کے صرف اس مقصد کے لئے سرگرم عمل نظر آتا ہے کہ اس کی قوم کا وجود اجتماعی فنا نہ ہونے پائے۔

مکاڈو کے بعد کا زمانہ مکاڈو کے بعد اُس کا بیٹا یوشی ہیتو تخت نشین ہوا، جس کی عمر ۴۳ سال کی تھی۔ اسے علوم جدیدہ میں کافی مہارت حاصل تھی، لیکن بدقسمتی سے نہایت کمزور اور دائم المرض تھا۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے اپنے بیٹے ہیرو ہیتو کو سلطنت سپرد کر دی۔ یہ اپنے دادا مکاڈو سے، صورت و سیرت میں بہت کچھ مشابہ ہے اور معمولی امیرزادوں کے ساتھ مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی اور علوم مختلفہ میں اس نے کافی مہارت حاصل کی ہے، اور اس کی تمام اداؤں سے ہمت و جرأت، عروج و ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔ اسوقت اسکی عمر ۲۱ سال کی ہے اور تمام یورپ کی سیاحت کر چکا ہے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کرتا ہے۔ ابتدا میں وہ اک معمولی افسر کی حیثیت سے فوج میں داخل ہوا، جو جاپان کی تاریخ میں پہلی مثال ہے۔

جاپان کا اقتصادی مسئلہ گذشتہ نصف صدی کے اندر جو اقتصادی انقلاب جاپان میں ہوا ہے، اُسے دنیا کی حکومتیں نہایت عمیق نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ چونکہ جاپان نہایت تنگ ملک ہے اور اس کی ۵ کروڑ آبادی جو حیرت انگیز رفتار سے بڑھ رہی ہے، اس محدود جزیرے میں نہیں سما سکتی، اس لئے وہ مجبور ہے کہ قرب و جوار میں اثر پیدا کر کے اپنے ملک کو وسیع کرے۔ ۱۸۷۲ء میں اس کی آبادی صرف ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی اور ۱۹۲۰ء میں وہ ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ تک پہونچ گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہاں کی محدود زراعت ضروریات زندگی کو بھی پورا نہیں کر سکتی اور اس کی عظیم الشان صنعت و حرفت کے لئے وہاں کی زمین "مواد اولیہ" (Raw Material) بھی کافی مقدار میں پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے جاپان مجبور ہے کہ وہ باہر سے غلہ وغیرہ اپنے لئے طلب کرے اور اپنی مصنوعات کو خارجی دنیا میں بھیجنے کے لئے منافذ تجارت تلاش کرے۔ پھر چونکہ جاپان کو سوائے چین کے اور کوئی ملک ایسا نظر نہیں آتا جو آسانی سے اس کمی کی تلافی کر سکے، اس لئے وہ مشرق اقصیٰ میں اپنا اثر قائم کرنیکی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن چونکہ دول یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ اس کو گوارہ نہیں کر سکتا اور خود چین بھی اب بیدار ہو گیا ہے، اس لئے جاپان کے لئے اس معمے کو حل کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

نیاز

زیب النساء

عہد مغلیہ کی خصوصیات عہدِ مغلیہ کی جس قدر خصوصیات، اس وقت تک تاریخ نے ظاہر کی ہیں، اگر ان سب کو پیشِ نظر رکھ کر اک اجمالی نتیجہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونگے کہ بابر سے لیکر جو ہندوستان کے عہدِ مغلیہ کا مؤسس اولین تھا، بہادر شاہ ظفر کے وقت تک جو اس بزمِ ملوکانہ کا آخری بدنصیب تاجدار تھا، کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں حضارت و تمدن اور تہذیب و شائستگی کے کھلے ہوئے آثار و علائم نظر نہ آتے ہوں۔

حرم کی پُر سکون زندگی سے لیکر، جہاں خلوت کا حصار اک انسانی حقیقت کو زیادہ صحیح روشنی میں پیش کرتا ہے، دربار کے ہنگامہ تک، جہاں شخصی حکومت کو اظہار کبر و نخوت اور نمائش وحشت و درندگی کے بہترین مواقع حاصل ہوتے ہیں، کوئی مغل فرمانروا ایسا نہیں گذرا جس نے جادۂ اعتدال سے انحراف کیا ہو یا عوایدِ تہذیب کا سر رشتہ ہاتھ سے دیدیا ہو۔

ایک حکومت کے صحت و سقم معلوم کرنے کا بہترین معیار، اس کا نظامِ تعلیم ہے اور غالباً یہ خصوصیت صرف تیموریہ خاندان ہی کے افراد کو حاصل ہے کہ اُن میں سے کوئی فرد ایسا نہیں گذرا، جو اس سے غافل ہوگیا ہو۔ اور جس نے علوم و فنون کو عام کر دینے میں پوری کاوش سے کام نہ لیا ہو۔ چونکہ موضوعِ سخن کے لحاظ سے، میں اس وقت اس مسئلہ پر بسیط گفتگو نہیں کرسکتا، اس لئے اسے کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں اور یہاں نہایت اختصار کے ساتھ صرف یہ ظاہر کرکے کہ مغلوں کو تعلیم نسواں کی جانب کس قدر توجہ تھی، اصل موضوع پر گفتگو کردوں گا۔

تعلیم نسواں عہدِ حاضر میں۔ جب کہ تمام علوم و فنون عروج کے بلند ترین نقطہ تک پہنچ گئے ہیں، یہ حقیقت عام طور سے تسلیم کرلی گئی ہے، ایک ملک و قوم کی تہذیب اور شائستگی کی قوی ترین دلیل یہ ہے کہ اس کی عورتیں مہذب و تعلیم یافتہ ہوں، اور جب ہم اس معیار کو پیشِ نظر رکھکر، عہدِ مغلیہ پر تنقید کرتے ہیں، تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ زمانہ حکومتِ ہند کا بہترین زمانہ تھا اور اگر ہم تاریخ ہندوستان میں کسی عہد کو "عہدِ زریں" کہہ سکتے ہیں تو وہ مغلوں ہی کا دورِ حکومت تھا۔
یوں تو عہدِ مغلیہ سے قبل بھی مسلمان فرمانروایانِ ہند، اس طرف سے غافل نہ تھے اور خواتین کی تعلیم کیلئے

اس وقت بھی خاص انتظام کیا جاتا تھا[1] لیکن عہد مغلیہ میں اس کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی اور شاہزادیوں کی تعلیم کا اہتمام زیادہ وسیع پیمانہ پر کیا گیا۔

بابر کی عمر، جس اضطرار و اضطراب میں بسر ہوئی، وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن بااینہمہ اس کا علمی ذوق کبھی اس سے جدا نہیں ہوا، اسی کا اثر تھا کہ اس کی بیٹی گلبدن بیگم، باوجود بے سروسامانی کے تعلیم سے محروم نہیں رہی اور آج بھی وہ اپنی تصنیف، ہمایوں نامہ کے ذریعہ سے روشناس عالم ہے۔ ہر چند تاریخ اس باب میں ساکت ہے کہ گلبدن بیگم کی تعلیم کن اصول پر ہوئی، لیکن اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اس نے جو لائبریری اپنے لئے فراہم کی تھی، وہ اس وقت کی بہترین لائبریری سمجھی جاتی تھی۔

علاوہ گلبدن بیگم کے، ہمایوں کی بھانجی سلیمہ سلطانہ بھی اپنے عہد کی نہایت قابل خاتون تھی اور ہیئت و ریاضی کی بڑی ماہر۔ ادبی قابلیت اور پاکیزگی ذوق کے ثبوت میں اس کا یہ شعر لکھ دینا کافی ہے:۔

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام

مست بودم، زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

یہی وہ سلیمہ سلطانہ ہے، جو بعد کو اکبر سے منسوب ہوئی۔ یہ ذکر ہے عہد بابر کا جب مغلوں کی حکومت نہایت محدود تھی اور کوئی معقول انتظام لڑکوں کی تعلیم کا بھی نہ تھا، چہ جائیکہ لڑکیاں، ورنہ عہد اکبری میں تو تعلیم خواتین کیلئے باضابطہ مدرسہ قائم ہو گیا تھا جس کے آثار فتحپور سیکری میں اب بھی موجود ہیں، اور متعدد خواتین ایسی نکلیں، جنکی قابلیت صفحات تاریخ پر منقوش ہے۔

نور جہاں بیگم، جہاں آرا، ممتاز محل، روشن آرا، حمیدہ بانو، رضیۃ النساء، جمیلہ خاتون، موتی بیگم، اشرف النساء وغیرہ وہ ہستیاں تھیں، جن پر عورت کی دنیا ناز کر سکتی ہے اور جن کی علم پروری کا یہ عالم تھا کہ باوجود بے پردگی کے وہ کمال کی داد دینے سے احتراز نہ کرتی تھیں۔ جہاں آرا بیگم (زیب النساء کی پھوپھی) کا واقعہ ہے کہ وہ ایکدفعہ باغ میں سیر کی غرض سے گئی۔ اور پردہ کرا دیا گیا، لیکن صیدی طہرانی باغ کے کسی حجرہ میں چھپ گیا اور سواری کا تماشہ دیکھنے لگا۔ جب جہاں آرا بیگم، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے اس طرف سے گذری تو صیدی نے بیتاب ہو کر یہ مطلع پڑھا:۔

---

[1] سلطان غیاث الدین (مالوہ) کی حرم سرا میں پندرہ ہزار عورتیں تھیں، جن میں ایک معقول حصہ اُن عورتوں کا تھا، جو خواتینِ حرم کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیا کرتی تھیں اور جن میں موسیقی و نقاشی بھی شامل تھی۔

برقع بہ رُخ افگندہ بَرد ناز بہ باغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

بیگم نے حکم دیا کہ اس شخص کو سامنے لایا جائے۔ جب صیدی سامنے آیا تو بیگم نے کئی بار اس شعر کو سنا اور حکم دیا کہ اسے شہر سے نکال دیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ ذوقِ ادب کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی اور پانچ ہزار روپیہ بھی بطور انعام اس کو دیئے گئے۔ انہی میں سے ایک زیب النساء بیگم بھی تھی، جس کی تصویر آج نگار کا سرمایۂ ناز ہے۔

افسوس ہے کہ اس محترم خاتون کے حالات بہت کم ملتے ہیں اور مفصل واقعاتِ زندگی کہیں درج نہیں ہیں، تاہم جو کچھ معلوم ہے، وہ بھی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ وہ غیر معمولی دل و دماغ کی عورت تھی اور فضل و کمال، اور فراست و ذہانت کے لحاظ سے، وہ حقیقی معنی میں اورنگ زیب کی بیٹی تھی۔

اورنگ زیب کی شادی

شاہ جہاں کی حکومت شباب پر تھی یعنی اہل مغلیہ کے اس لطیف الطبع فرمانروا کی سلطنت کا دسواں سال تھا کہ اسے اورنگ زیب کے عقد کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ دربارِ مغلیہ بہترین علماء و فضلاء کا مرکز رہا کرتا تھا اور منتخب ترین صاحبانِ سیف و قلم وہاں جمع رہتے تھے، اس لئے شاہزادگانِ مغلیہ کا رشتہ ازدواج ان ہی امراء کے خاندانوں سے وابستہ کیا جاتا تھا اور اسی کی پیروی شاہجہاں نے بھی کی۔

بدیع الزماں صفوی جس نے عہدِ جہانگیری میں اپنی ممتاز خدمات کی وجہ سے شاہ نواز خاں کا لقب حاصل کیا تھا، دربارِ شاہجہانی سے وابستہ تھا اور اس کی بیٹی دل رس بانو بیگم اپنے حسنِ صورت و سیرت کے لحاظ سے مشہور تھی۔ چنانچہ شاہجہاں نے اورنگ زیب کی رفیق بننے کے لئے اس سے بہتر کسی کو نہ پایا اور سنہ ۱۰۴۶ھ میں چار لاکھ مہر پر رشتۂ مواصلت قایم کر دیا گیا۔ طالب کلیم کا مادۂ تاریخ "دو گوہر بہ یک عقد دوراں کشیدہ" اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

زیب النساء کی ولادت اور اس کا عہدِ طفلی

اورنگ زیب دکن کا گورنر ہونے کی وجہ سے دولت آباد میں مقیم تھا کہ شادی کے دوسرے سال سنہ ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں زیب النساء پیدا ہوئی۔ چونکہ اورنگ زیب کی یہ پہلی اولاد تھی اس لئے اظہارِ مسرت میں دکن کے اس اولو العزم گورنر نے نہایت فیاضی اور سیر چشمی سے کام لیا۔

جب زیب النساء کی عمر چار سال سے متجاوز ہوگئی تو اورنگ زیب کو اس کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اور جستجو کی گئی کہ امرائے دربار میں سے کس امیر کے گھر کی عورتیں اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دے سکتی ہیں۔ آخر کار

عنایت اللہ خاں میناپوری کی ماں حافظہ مریم (جسے حافظہ صرف اس لئے کہتے تھے کہ وہ حافظہ قرآن بھی تھی) ابتدائی تعلیم کے لئے منتخب ہوئی۔ حافظہ مریم نہایت قابل خاتون تھی اور مذہبی معلومات کے لحاظ سے ایک جید عالم کا درجہ رکھتی تھی۔ حافظہ مریم نے سب سے پہلے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا اور چند سال میں اُسے بھی اپنی طرح حافظ بنا دیا۔ اورنگ زیب کو اس قدر مسرت ہوئی کہ اس نے علمائے عصر کو دعوت دی اور دربار عام منعقد کرکے حافظہ مریم کو تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔

تعلیم کلام مجید حفظ کرلینے کے بعد ملا جیون جو اورنگ زیب کے بھی اُستاد رہ چکے تھے عربی اور فارسی کی تعلیم کیلئے مامور ہوئے۔ زیب النسا چونکہ حد درجہ ذہین واقع ہوئی تھی اس لئے اس نے بہت جلد تمام علوم متداولہ حاصل کرلئے۔ افسوس ہے کہ تاریخ کی کتابیں اس باب میں ساکت ہیں اور زیب النسا کے عہد تعلیم و تربیت کے جزئیات سے کسی مورخ نے بحث نہیں کی، ورنہ یقیناً بہت دلچسپ موضوعِ سخن ہوتا۔ تاہم اس امر پر تمام مورخین متفق ہیں کہ اس کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی اور نحو و صرف، فقہ و حدیث میں مہارت تامہ رکھتی تھی۔ وہ بے انتہا خوشخط بھی تھی اور نسخ، نستعلیق اور شکست خط اس قدر پاکیزہ ہوتا تھا کہ اسے بہترین نقاشی کے حدود میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ شعر و ادب کا ایسا صحیح ذوق اس کے اندر پایا جاتا تھا کہ جب ۱۴ سال کی عمر میں وہ تمام اکتسابات ذہنیہ سے فارغ ہوئی تو اس کا دربار علماء و فضلاء شعراء ادباء کا مرکز ہوگیا اور اس کی علم پروری، نکتہ شناسی، صحت فکر، اصابت رائے، پاکیزگی ذوق اور لطافت طبع تمام مجالس کا ایک مستقل موضوع گفتگو ہوکر رہ گئی۔

شعراء اور اہل کمال کی قدر دانی چونکہ اورنگ زیب کو شعراء کی طرف زیادہ میلان نہ تھا اور وہ شعراء کی اہمیت کو صرف بقدر ضرورت تسلیم کرتا تھا، اس لئے وہ قدر شناسی شعر کے لحاظ سے کسی خاص امتیاز کا مالک نہیں تھا لیکن چونکہ قدرت کو عہد مغلیہ کی اس روایت دیرینہ کو بدستور قائم رکھنا منظور تھا۔ اس لئے اس نے زیب النسا کو پیدا کردیا جس نے اپنے باپ کی اس کمی کو بوجہ احسن پورا کیا۔ اور اُس وقت کے تمام شعراء دربار زیب النساء کے وظیفہ خوار ہوگئے۔

اورنگ زیب کی بیٹی کا صرف ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہونا فطرت کی ایسی ستم ظریفی ہے کہ اس کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے لیکن چونکہ یہ ذوق اس کا بالکل فطری ذوق تھا اس لئے اورنگ زیب بھی اسے باز نہ رکھ سکا اور مجبوراً ملا سعید اشرف کو جو اس عہد کا نہایت مشہور شاعر تھا مامور کیا کہ وہ شہزادی کی نظم و

ونثر کو بہ نظر اصلاح دیکھا کرے۔

زیب النسار کو نظم کا اس درجہ شغف تھا کہ اس کے گرد و پیش ہر وقت یہی ذکر رہتا تھا اور اسکی کنیزیں تک اسی رنگ میں ہوبی ہوئی تھیں۔ تذکرہ ماہ درخشاں میں اسکی ایک کنیز اانی دہلوی کا یہ شعر نقل کیا ہے

آنقدر روز ازل تیرہ نصیبم کردند ؛؛
تیرگی می طلبد شام غریباں از من

علم نوازی اور عام اخلاق | ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ شعرار کی ایک جماعت اس کی وظیفہ خوار تھی لیکن شاعری میں ہی اپنا وقت ضائع نہ کرتی تھی، بلکہ اپنی نگرانی میں وہ اہل کمال سے مختلف فنون کی کتابیں بھی مرتب کراتی تھی۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بہت سے علمار اور خوشنویس بھی اس کے وظیفہ خوار تھے۔ زیب النسا نے تصنیف و تالیف کی غرض سے ایک کتب خانہ بھی قایم کیا تھا جس کے متعلق مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ اس عہد میں کوئی کتب خانہ اس درجہ مکمل و مرتب نہ تھا اسی کتب خانہ کے متعلق اس نے ایکاڈمی قایم کی تھی، جہاں علمائے عصر تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان تمام کتابوں کی فہرست جو اس دار العلوم میں تصنیف کی گئیں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ صرف امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ جسے ملا صفی اردبیلی نے کیا تھا اور جو زیب التفاسیر کے نام سے مشہور ہے زیب النسا کی یادگار باقی رہ گیا ہے۔

خود زیب النسا نے جو تصانیف کیں اُن کا بھی علم کسی کو نہیں۔ تذکرہ مشاہیر نسواں میں مونس الارواح کو اور تذکرۃ الغرائب میں زیب المنشآت کو اس سے منسوب کیا ہے۔ اول الذکر تصنیف تصوف میں تھی اور دوسری اس کے رقعات و خطوط کا مجموعہ تھا۔

زیب النسا اپنی فطرت کے لحاظ سے حد درجہ نفیس الطبع متحمل مزاج، رقیق القلب اور متصوفانہ رنگ کی خاتون تھی۔ وہ اہل کمال کی قدر کرنے میں بسا اوقات حد سے گذر جاتی تھی۔ ایک بار ملا سعید اشرف کو زیب النسا نے ایک کنیز مرحمت کی، لیکن وہ کنیز ملا صاحب کے مذاق کے موافق نہ تھی، اس لئے انہوں نے اس کو ایک طویل قصیدہ ہجو کے ساتھ واپس کیا۔ اس قصیدہ کے بعض اشعار نہایت غیر مہذب اور نامناسب تھے، لیکن زیب النسار نے کچھ نہیں کہا اور خاموش ہوگئی۔

اسی طرح نعمت خان عالی نے جو اس عہد کا نہایت مشہور شاعر تھا ایک مرتبہ کوئی مرصع کلغی فروخت کے لئے پیش کی اور جب عرصہ تک کوئی جواب نہ ملا تو یہ رباعی لکھ کر بھجوا دی۔

ا اوج نعمت خان ۲۵۰ ۲۵۷

اے بندگیت سعادت اخترِ من — در خدمتِ تو عیاں شدہ جوہرِ من
گرچیز خریدنی است ایں گوزرِ من — در نیست خریدنی بزن بر سرِ من

زیب النسا نے پانچہزار روپے بھجوا دیئے اور کلغی بھی واپس کردی۔

زیب النسا ہرچند درویشانہ مذاق رکھتی تھی تاہم وہ حد درجہ نفیس المزاج تھی، چنانچہ کشمیر میں جو اسکی جاگیر میں تھا۔ نہایت عمدہ باغ نصب کرایا اور اس میں نفیس عمارتیں تیار کرائیں۔ اس نے ایک بڑا خیمہ ابرک کا بھی تیار کرایا تھا جو بالکل شیشہ کا معلوم ہوتا تھا نعمت خان عالی کی مثنوی اس خیمہ کی تعریف میں مشہور ہے۔

زیب النسا کو اپنے بھائیوں سے بہت محبت تھی، یہانتک کہ جب ۱۱۰۵ھ میں اعظم شاہ مرض استسقا میں مبتلا ہوا اور زیب النسا اس کی تیمار دار رہی تو جب تک وہ بیمار رہا، سوائے اس پرہیزی غذا کے جو محمد اعظم کھاتا تھا اس نے بھی اور کچھ نہیں کھایا۔ دوسرے بھائی اکبر شاہ کی محبت میں تو وہ قید ہی ہوگئی جسکا ذکر آگے آئیگا۔

الغرض زیب النسا کی یہی وہ صفات تھیں جنہوں نے اس کو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا اور جن کی وجہ سے اورنگ زیب بھی اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔

جب کبھی زیب النسا باہر سفر سے آتی تو اورنگ زیب شاہزادوں کو اس کے استقبال کے لئے بھیجتا جبتک عالمگیر نے فتح دکن کی طرف توجہ نہیں، زیب النسا ہمیشہ سفر حضر میں اس کے ساتھ رہی اور وہ ہمیشہ اس کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتا رہا۔

زیب النسا کی شاعری زیب النسا کو شاعری کا جس قدر صحیح ذوق حاصل تھا، اس کا اقتضا ہی تھا کہ وہ اپنے کلام کا ایک دفتر چھوڑ جاتی، لیکن افسوس ہے تذکرہ نویسوں کو اس کا کلام بہت کم دستیاب ہوا۔

چونکہ مخفی متعدد خواتین اور بعض مردوں کا بھی تخلص تھا[۱]، اس لئے تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ موجودہ دیوان مخفی جو عام طور سے پایا جاتا ہے واقعی زیب النسا کا تھا۔ بعض صاحبان تذکرہ نے صرف یہ دو شعر اس کے نقل کئے ہیں:۔

---

[۱] سلیمہ بیگم، امام قلی خاں حاکم فارس کا ایک مصاحب، حضرت جامیؒ کے استاد، زیب النسا کا ایک خادم اور آخر عہد میں سلطان جہاں بیگم اہلیہ میرزا قادر بخش شہزادہ دہلی کا بھی یہی تخلص تھا سلطان جہاں کا ایک شعر اس وقت یاد آگیا:۔

"خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی — کہ اس ظلم پر جی کو بھاتا بہت ہے"

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد — کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت — غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

لیکن تذکرۂ شمعِ انجمن، تذکرۃ الخواتین اور تذکرہ مشاہیرِ نسواں میں اور اشعار بھی اس کے درج گئے ہیں، جن کا انتخاب ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

خیز و کرشمہ ریز کن نرگسِ نیم مست را — از تہِ جام جرعہ دہ ساقیِ مے پرست را
بہرِ شہادتِ جہاں یک نگہ از تو بس بود — گرم غضب چہ میکنی غمزۂ تیز دست را

قطعِ جفائی کند دلبرِ شوخ و مستِ ما — ترکِ وفائی دہد ایں دلِ خود پرستِ ما

باز امشب نالۂ زارم پریشاں می رود — سیلِ اشکم دست در آغوشِ طوفاں می رود

تو و بوستانِ حسن کہ نسیم رہ نیابد — من و نالہ ہائے زاری کہ بلب گذر نیابد

پروانہ نیستم کہ بیکدم عدم شوم — شمعم کہ جانگدازم و دودے نیاورم

نہال سرکش و گل بے وفا و لالہ دو رنگ — دریں چمن بہ چہ امید آشیاں بندم

اے صبا خاک رہش آر و بہ اندازِ بہ چشم — کہ بلا ہا ہمہ زیں رخنہ بروں می آید

آں شوخ چیرہ بند سوارِ سمند شد — یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

باز ما مپوش چہرہ کہ ما بہ ادب نہ ایم — کوتہ تر است از مژۂ ما نگاہِ ما

۱ نورم، نارم، حدیقه ام، گلزارم ۞ دیرم، صنمم، برهمنم زنارم ۞ ۞
نے نے غلطم دریں میاں ہیچ نیم بوئے گلم و طبیعت بیمارم ۞ ۞

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا
در سخن پنہاں شدم مانندِ بو در برگِ گل ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا

از تاب و تبم مہر سما را کہ خبر کرد وز گریۂ من ابر و ہوا را کہ خبر کرد
بیروں ہمہ سرسبز و درونش ہمہ پرخوں از حالتِ من برگِ حنا را کہ خبر کرد

شادی سے احتراز مغلوں میں عام دستور تھا کہ وہ لڑکیوں کی شادیاں پختہ عمر میں کیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ زیب النسا کے عقد کا خیال اس وقت آیا، جب وہ سن وقوف کو پہنچ چکی تھی، پھر چونکہ اس عرصہ میں ایک خاص قسم کا صوفیانہ اور درویشانہ مذاق اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اس نے شادی سے انکار کر دیا اور ساری عمر حالت دوشیزگی میں بسر کر دی۔

زیب النسا اور عاقل خاں اردو کی معمولی اور سوقیانہ لٹریچر میں عام طور سے مشہور ہے کہ زیب النسا کو عاقل خان سے محبت تھی اور خفیہ طور پر دونوں باہم ملا کرتے تھے۔

تاریخی اصول سے جب اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو اس کی حقیقت ایک لغو افسانہ سے زیادہ نہیں ٹھیرتی اور سخت افسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے کیوں ایسی عصمت کوش اور عفت مآب خاتون کی روح کو اس اتہام سے اذیت پہونچائی۔

عہد عالمگیر اور اس کی ایک صدی بعد تک کی کسی تاریخ میں نہیں پایا جاتا کہ زیب النسا کو عاقل خاں یا کسی اور سے محبت تھی۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ دربار عالمگیر کے مورخین کیونکر اس راز کو ظاہر کر سکتے تھے لیکن تماشا تو یہ ہے کہ اس واقعہ کا اُن مورخین نے بھی کہیں ذکر نہیں کیا جو دربار سے غیر متعلق ہو کر مخفی طور پر اپنی تاریخیں مرتب کر رہے تھے۔ اس کا ذکر نہ خافی خاں نے کیا ہے جس نے اپنی تاریخ کو عالمگیر کے ایک ربع صدی بعد مرتب کیا اور نہ مآثر الامرا میں اس کا بیان ہے جو اس کے بعد کا تذکرہ ہے علاوہ انکے

بھیم سین اور ایشوردا س ہندو مورخین بھی اس باب میں ساکت ہیں حالانکہ ان کی تاریخ بہت بعد کو منصۂ شہود پر آئی۔
برنیر اور منوچی نے بھی، جنہوں نے صرف اپنے ہی ملک کے لئے واقعات سیاحت قلمبند کئے تھے اور جنھیں مغل دربار کا کوئی خوف نہ تھا، اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، درانحالیکہ انہوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام وہ باتیں درج کر دی ہیں جن سے مغل دربار کی توہین ہو سکتی تھی۔ اگر زیب النسا کے عشق و محبت کا افسانہ صحیح ہوتا تو کیا وہ اسے نظر انداز کر جاتے اور کیا اس سے بہتر موقع طعن و تشنیع کا انہیں کوئی اور مل سکتا تھا۔ خافی خاں جو تمام روایات کو بلا نقد و تحقیق درج کرنے میں بے انتہا دلیر واقع ہوا تھا اور جس نے نور جہاں اور جہانگیر کے معاملۂ محبت پر سخت نکتہ چینی کی ہے، وہ بھی زیب النسا کے حالات میں کہیں اس کی محبت کا ذکر نہیں کرتا۔
واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانہ انیسویں صدی کی اختراع ہے اور سب سے پہلے جس نے یہ غیر معصوم لٹریچر پیش کیا وہ منشی احمد الدین لاہوری ہیں، جنہوں نے محمد الدین خلیق کی حیات زیب النسا کو پیش نظر رکھ کر در مکتوم کے نام سے ایک کتاب اس محترم خاتون کے حالات میں مرتب کی۔ اس کے بعد مسز ویسٹ بروک نے دیوان زیب النسا کے دیباچہ میں اسی کتاب سے مدد لیکر انگریزی میں بھی اس کذب کو منتقل کر دیا، یہاں تک کہ اب عام طور سے ہر شخص زیب النسا کو اسی روشنی میں دیکھنے لگا۔
مسز ویسٹ بروک لکھتی ہیں کہ:۔ "دو شنبہ ۱۶۶۲ء کی ابتدا میں جب اورنگ زیب بیمار ہوا اور اطبائی دربار نے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا تو وہ تمام خواتین حرم کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ اس وقت عاقل خاں، جو اورنگ زیب کے وزیر کا بیٹا تھا، لاہور کا گورنر تھا۔ چونکہ یہ خود بھی اچھا شاعر تھا، اس لئے زیب النسا کے کلام کو سن سن کر غائبانہ عاشق ہو گیا تھا اور اس کو دیکھنے کے لئے از بس بیتاب تھا، چنانچہ اس نے قصر شاہی کے چاروں طرف حفاظت و نگرانی کے بہانہ سے طواف کرنا شروع کیا کہ شاید اسی طرح کوئی جھلک نظر آ جائے۔ ایک صبح جبکہ وہ دیوار کے نیچے کھڑا تھا، زیب النسا گلنار لباس میں بام خانہ پر جلوہ افروز ہوئی۔ عاقل خاں نے اس کو دیکھتے ہی فوراً یہ مصرعہ پڑھا "سرخ پوشے بہ لب بام نظر می آید" زیب النسا نے جواب میں دوسرا مصرعہ پڑھا "نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید"۔ چونکہ زیب النسا کو لاہور بہت پسند آیا تھا اس لئے اس نے وہیں ایک باغ کی طرح ڈال دی اور نہایت شوق سے اس کی تعمیر و انتظام میں دلچسپی لینے لگی۔ ایک دن عاقل خاں کو معلوم ہوا کہ زیب النسا باغ میں موجود ہے اور سنگ مرمر کی جو عمارت وہاں طیار ہو رہی ہے اسے دیکھ رہی ہے۔ عاقل خاں بھی ایک معمار کے لباس میں وہاں پہونچ گیا اور باہم تبادلۂ اشعار ہوا۔ اس کے بعد یہ دونوں ملتے رہے اور اورنگ زیب

کو بھی اس کا حال معلوم ہوا جو اس وقت دہلی میں تھا۔ چنانچہ یہ فوراً لاہور گیا اور زیب النسا کی شادی کر دینی چاہی تھی۔ زیب النسا نے کہا کہ مجھے انتخاب کا اختیار دیا جائے، اور جب تصاویر پیش کیا ہوئیں، تو اس نے عاقل خاں کو پسند کیا اورنگ زیب نے عاقل خاں کو طلب کیا، لیکن اس کے رقیب نے اسے دھوکا دیکر یہ یقین دلایا کہ اورنگ زیب تمہیں ہلاک کرنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ عاقل خاں یہ سنکر ڈر گیا اور تعمیل حکم سے انکار کرتے ہوئے ملازمت سے بھی مستعفی ہو گیا۔ اس کے بعد جب زیب النساء دہلی گئی تو عاقل خاں بھی وہاں پہونچا۔ ایک دن جب کہ یہ دونوں شاہی باغ میں موجود تھے، اورنگ زیب پہونچ گیا اور مجبوراً عاقل خاں کو ایک دیگ میں چھپ جانا پڑا جو وہیں رکھا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ اس میں پانی گرم کرنے کو رکھا ہے، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ اس کے نیچے آگ روشن کی جائے، چنانچہ عاقل خاں اسی کے اندر جل کر مر گیا اور زیب النساء قلعہ سلیم گڑھ میں قید کر دی گئی "

یہ ہیں وہ واقعات جو زیب النساء سے منسوب کئے جاتے ہیں اور جو تاریخ کے صحیح معیار پر بالکل لغو اور نادرست ثابت ہوتے ہیں۔ مورخانہ تنقید کا اقتضاء ہے کہ سب سے پہلے عاقل خاں کی ہستی پر غور کیا جائے۔

عاقل خاں کا اصلی نام میر عسکری تھا جو ایران کا رہنے والا خوافی الاصل تھا۔ وزیر کا بیٹا ہونا کہیں ثابت نہیں ہے، عہد شاہ جہان میں، جب اورنگ زیب دکن کا گورنر تھا، تو عاقل خاں اس کا جلودار (ہمہ مصنھے) تھا۔ عاقل خاں نہ صرف اپنے عہد کا اچھا شاعر تھا، بلکہ درویشانہ ذوق بھی رکھتا تھا، چنانچہ اس نے اپنا تخلص رازی صرف اسی لئے پسند کیا تھا کہ وہ شاہ برہان الدین راز الٰہی کا مرید تھا۔ جب اورنگ زیب، حصول سلطنت کے لئے، دکن سے دہلی کی طرف روانہ ہوا، تو اس نے خواتین کو قلعہ دولت آباد میں چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ ۱۶۵۷ء کا ہے، ۶ر فروری سے شہر کی گورنری، اور اگست ۱۶۵۸ء سے ۱۶۵۹ء کی آخر تک قلعہ کی حفاظت اس کے سپرد رہی۔ جب ۸ر فروری ۱۶۶۰ء کو وہ دہلی آیا، تو دوآبہ کا فوجدار بنا دیا گیا۔ نومبر میں بیمار ہو جانے کی وجہ سے، اس نے ملازمت سے دست کشی اختیار کی اور سات سو پچاس روپیہ ماہوار پنشن حاصل کر کے لاہور میں اقامت اختیار کر لی۔

جب نومبر ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب، کشمیر سے واپس ہوا اور مع اپنی خواتین کے لاہور میں مقیم ہوا، تو عاقل خاں حاضر ہوا اور اورنگ زیب نے اسے داروغہ غسلخانہ کر دیا، جو نہایت اعتماد و اعتبار کا عہدہ تھا (یہ واقعہ ۲ر نومبر کا ہے)، اس کے بعد بھی عاقل خاں پر عنایات شاہانہ مبذول رہی اور ۱۶۶۹ء میں وہ داروغہ ڈاک چوکی

(پوسٹ ماسٹر جنرل) بنا دیا گیا، لیکن اپریل ۱۶۶۹ء میں اس نے استعفا دیدیا۔ اس کے بعد سات سال تک وہ حالت گمنامی میں رہا اور تاریخ میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ پھر ۱۶۷۶ء میں ایک ہزار روپیہ ماہوار اس کی پنشن مقرر کی گئی اور ۱۶۸۱ء میں وہ دہلی کا صوبہ دار بنا دیا گیا اور آخر وقت تک (یعنی ۱۶۹۶ء تک) اسی عہدہ پر ممتاز رہا۔

ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ عاقل خاں اپنی فطری موت سے مرا، اور دیگ کے اندر جل کر مر جانا بالکل خلاف حقیقت ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ زیب النساء سے محبت کرنے کے مواقع کب اور کیونکر عاقل خاں کو حاصل ہو سکتے تھے؟

سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ خواتین کی حفاظت و نگرانی کے لئے کبھی کوئی نوجوان آدمی مقرر نہیں ہو سکتا تھا، اور اس لئے اس وقت بھی، جب اورنگ زیب، دولت آباد سے روانہ ہوا، عاقل خاں، سن وقوف کو پہنچ گیا ہوگا۔ عاقل خاں کے واقعات حیات استقصار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اُسے زیب النساء کا قرب حاصل ہوا بھی ہوگا، تو سب سے پہلے دولت آباد میں (۱۶۵۸ء)، اس کے بعد ایک ہفتہ کے لئے لاہور میں (۱۶۶۳ء) اور پھر ۱۶۸۱ء سے ۱۶۹۶ء تک، جب وہ دہلی میں مستقل طور سے صوبہ داری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ پھر چونکہ دولت آباد کے قیام میں افسانہ محبت کا شروع نہ ہونا سب کو تسلیم ہے اور ۱۶۶۳ء میں صرف ایک ہفتہ کی قلیل فرصت معاملہ کو اس حد تک پہونچا دینے کیلئے کافی نہ ہو سکتی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ عاقل خاں کو دہلی ہی کے قیام میں اس کا موقع ملا ہوگا، پھر اگر تمام واقعات تاریخی کو نظر انداز کر دیا جائے، تو بھی یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ عاقل خاں دوران قیام دہلی میں، جب کہ اس کی عمر پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی، کیونکر اس درجہ پُر جوش محبت کرنے پر مجبور ہو سکتا تھا کہ دیگ کے اندر جل کر مر جائے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سات سال تک عاقل خاں کا معتوب رہنا، صرف اسی وجہ سے تھا، اور اس کے ثبوت میں شاہزادہ اکبر کی وہ تحریر پیش کرتے ہیں جس میں اُس نے اپنی بہن زیب النساء بیگم کو لکھا تھا کہ "چونکہ بادشاہ نے حکم دیدیا ہے کہ کوئی تحریر جس پر عاقل خاں کی مہر ہو اندر نہ جانے پائے، اس لئے میں اب زیادہ احتیاط سے کام لونگا۔" لیکن یہ بالکل غلط استدلال ہے، کیونکہ اول تو اس عتاب کے بعد اُس کا پھر دربار عالمگیری میں بار پانا اور معزز خدمات پر مامور ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ عتاب کی وجہ (اگر کوئی تھا، اور کچھ تھی)، ورنہ ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کبھی اس کو دہلی میں رہنے کا موقع نہ دیتا جہاں وہ با آسانی زیب النساء سے مل سکتا تھا۔ یہ تو محض استدلال قیاسی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس عاقل خاں کا ذکر، اکبر شاہ کی اس

تحریر میں ہے، وہ دوسرا ہی شخص تھا، جسے ملا محمد عاقل کہا کرتے تھے۔ چونکہ ملا محمد عاقل، اپنے عہد کا بڑا مشہور فقیہہ تھا اور مسائل فقیہہ کے متعلق زیب النساء کو اس سے خط و کتابت کرنے کی اجازت تھی، اس لئے اس کی تحریریں قلعہ کے اندر بغیر احتساب کے جا سکتی تھیں اور شاہزادہ اکبر اسی ذریعہ سے اپنی تحریریں زیب النساء کے پاس بھیجا کرتا تھا لیکن جب اورنگ زیب کو معلوم ہوا، کہ ملا محمد عاقل بھی شاہزادہ اکبر کا طرف دار ہے، تو اس نے اسکے خطوط کو بھی اندر جانے سے روک دیا، جسکا ذکر شاہزادہ اکبر نے اپنی اس تحریر میں کیا ہے۔ اگر یہاں بجائے ملا محمد عاقل کے، عاقل خاں مراد ہوتا، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک باغی کے طرفدار کو وہ چند دن بعد ہی دہلی کا صوبہ دار بنا دیتا۔

اورنگ زیب نے، زیب النساء کو ۱۶۸۱ء میں صرف اسی لئے قید کر دیا تھا کہ وہ اپنے حقیقی بھائی شاہزادہ اکبر سے جس نے عالمگیر کے خلاف راجپوتانہ میں علم بغاوت بلند کیا تھا، خط و کتابت رکھتی تھی۔ جب یہ بغاوت فرو ہوئی اور اجمیر کے قریب ۱۶۸۱ء میں زیب النساء اور شاہزادہ اکبر کے خطوط پکڑے گئے، تو اورنگ زیب نے اپنی بیٹی کی پنشن (چار لاکھ) ضبط کر لی اور قلعہ سلیم گڑھ میں مقید کر دیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اس کی عمر ۴۳ سال کی تھی اور عاقل خاں پچاس سال سے متجاوز ہو چکا تھا۔ یہ ہیں اصل واقعات جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عاقل خاں اور زیب النساء کا واقعہ عشق و محبت کس قدر لغو و باطل ہے۔

زیب النساء اور سیواجی

بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب ۱۶۶۶ء میں بمقام آگرہ سیواجی، اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا، تو زیب النساء نے اسے چھپ کے دیکھا اور فوراً عاشق ہو گئی۔ نصف صدی سے زاید زمانہ ہوا، جب ایک بنگالی مصنف نے اس کو ناول کی صورت میں تحریر کر کے یہ بھی بتایا ہے کہ کیونکر ان دونوں نے باہم انگوٹھیاں تبدیل کیں اور کس عالم میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ اس قدر عجیب و غریب کذب ہے کہ اس کی تردید کا خیال بھی دل میں لانا تضیع اوقات ہے۔

فارسی تاریخوں میں تو خیر، کہیں اس کا ذکر ہی نہیں ہے، لیکن خود مرہٹی تاریخوں اور سیواجی کی حالات میں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ کونسی عقل سلیم ہے، جو اس بات کا یقین کر لے گی کہ ایک مغل خاتون جو اپنے ذوق شعری کے لحاظ سے حد درجہ لطیف و نازک جذبات کی مالک تھی، سیواجی ایسے جاہل، وحشی اور غیر متمدن انسان سے محبت کرنے لگے گی۔

زیب النساء کا مقید ہونا

یہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ شاہزادہ محمد اکبر سے خط و کتابت جاری رکھنے کی خطا

ہیں، اورنگ زیب نے زیب النساء کو قلعہ سلیم گڈھ میں مقید کر دیا تھا، لیکن اس کے بعد مورخین کا اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ وہ اسی حالت میں مرگئی، بعض کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے چند دن بعد اسے آزاد کر دیا تھا۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حمیدہ بانو کے انتقال پر رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے، اورنگ زیب نے زیب النسا کو ہی مامور کیا تھا اور شاہزادہ کام بخش کی شادی بھی زیب النساء کے ہی محل سے ہوئی تھی، چونکہ یہ باتیں واقعہ قید کے بعد کی ہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی زیب النساء کا قصور معاف ہو چکا تھا اور وہ قید سے آزاد کر دی گئی تھی۔

وفات | اورنگ زیب کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا کہ زیب النساء نے دہلی میں انتقال کیا۔ اسکے مدفن کے متعلق مورخین کو اختلاف تھا، بعض کہتے تھے کہ کشمیر یا لاہور میں مدفون ہے، سر سید احمد خاں کی رائے تھی کہ وہ دہلی کی زینت المساجد میں مصروفِ خواب ہے، لیکن مولوی محمد حسین آزاد نے خود اس کی قبر کو دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ وہ دہلی ہی میں (کابلی دروازہ کے باہر) مدفون ہوئی اور بعد کو ادھر ریل نکلجانے کی وجہ سے مقبرہ کے آثار مٹ گئے۔ اس کی قبر کے کتبہ پر "داخلِ جنت" کندہ تھا جس میں ایک عدد کی زیادتی سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ اس کے قبر کی لوح اب تک سکندرہ (آگرہ) میں محفوظ ہے۔

نیاز

سب سے بڑا بم کا گولہ | امریکہ نے ایک عظیم ترین بم کا گولہ تیار کیا ہے، اس گولہ کا طول ۱۳½ فٹ اور قطر دو فٹ ہے اور اس کا وزن ۴۲۰۰ رطل سے زیادہ یعنی قریب دو ٹن کے ہے اس کے اندر ۲۰۰۰ رطل وزنی پھٹنے والا مادہ بھرا ہوا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ یہ گولہ امریکہ میں بنایا گیا تھا اور وہیں اس کا تجربہ کیا گیا، گولہ ایک ہوائی جہاز پر اٹھایا گیا، چونکہ اس سے پہلے کسی طیارہ نے اتنا وزن نہیں اٹھایا تھا اس سے طیارہ میں سے تمام غیر ضروری چیزیں علیحدہ کر دی گئیں تاکہ اس کا وزن ہلکا ہو جائے۔ پھر گولہ اس میں رکھ کر ہوا میں اٹھایا گیا اور تماشائی ۲۰۰۰ گز کے فاصلے پر کھڑے ہوئے جب گولہ طیارے سے چھوڑا گیا تو زمین پر پہنچتے ہی پھٹ گیا اور ایک ہولناک آواز ہوئی اور زمین کو دور دور تک اس نے پھاڑ ڈالا۔

دیہات کی صبح

ردائے آسمانی میں ستارے سو گئے تھک کر
نظر آتی ہے مشرق کی افق پر اک نقابِ زر
فضا میں ہر طرف پھیلا ہے اک نورِ نگہ پرور
وہ دھندلی سی فضا باقی نہیں اب اس پہاڑی پر

فضا میں شب کی وحشت خیز خاموشی نہیں باقی
وہ تاریکی، وہ غفلت اور وہ بے ہوشی نہیں باقی

ہوا میں ایک کیف اندوز، ہلکا سا تلاطم ہے
ہری کھیتی کے چہرہ پر نمایاں اک تبسم ہے
جو پتے مرتعش ہیں اُن کے لب پر اک تکلم ہے
ہری شاخوں کے رقصِ لاعبانہ میں ترنم ہے

ہوا نے گاؤں کے تالاب میں اک جان ڈالی ہے
ضیائے صبح سے ہر موج اک برقِ جمالی ہے

اندھیرے ہی سے وقفِ کار کھیتوں میں دہقاں ہیں
لگے ہیں کام میں سب لوگ گاؤں سارے ویراں ہیں
بیاباں میں گڈریے بھی ہیں اور بھیڑیں پریشاں ہیں
گڈریے نے بجا کر لحنِ دہقانی پہ رقصاں ہیں

کنوئیں سے لیکے پانی لڑکیاں وہ واپس آتی ہیں!
چھلک جاتی ہے جب گاگر تو ہنس کر بھیگ جاتی ہیں!

تمنا خیز ہے وہ بانسری کی لحنِ دہقانی!
یہ خودرو بیل بوٹے کر رہے ہیں نکہت افشانی!
ہے منظر میں تلون اور رنگوں کی فراوانی
فضا میں اک لطافت ہے اور اک پُر کیف عریانی

یہ شعریت فضا میں صبح کی دیوی نے پیدا کی
ہے یہ تنویر اسی کے بے تصنع حسنِ زیبا کی

لیا کرنوں نے اوجِ کوہ کا اک بوسۂ زریں
نمایاں رفتہ رفتہ ہو گیا پھر مہرِ پُر تمکیں
ضیا سے وسعتِ منظر میں اشیا جگمگا اٹھیں
بنایا مہر نے فطرت کے دلکش حسن کو رنگیں

نظر کو جذب کر لینے کی اک قوت ہے منظر میں،
ہے اک دوشیزگی فطرت کے حسنِ کیف پرور میں

ور میں

ہے مخلوقِ خدا مشغول کب سے کارِ دنیا میں
ہر انساں ہو گیا مصروف تحصیلِ تمنا میں؛

نہ اتنا بھول جا اپنے کو، دیدِ حُسنِ زیبا میں!
نہ ہو مخمور ایسا صبح کے کیفِ تماشا میں!

نہ رہ غافل، تصور کر غنیمت اس فراغت کو،
تلف غفلت شعاری میں نہ کر اس زندگی فرصت کو

غربت

محسوساتِ عزیز

عشق سے صرف ایک سوزِ دل مجھے حاصل ہوا
وہ بھی صرفِ گرمیٔ ہنگامۂ محفل ہوا

داستانِ زندگی کہنے کی ہے فرصت کسے
مختصر یہ ہے اب اُن کے رحم کے قابل ہوا

اُس نے گھبرا کر اُلٹ دی اپنے چہرے سے نقاب
الفراق اے روح اب جینا بہت مشکل ہوا

حُسن تھا روزِ ازل جس وقت سرگرمِ نمود
رُخ سے ٹپکا ایک قطرہ اور ظہورِ دل ہوا

روح کی خلقت کا پیکر میں وہی ہنگام تھا
دل ازل میں جب نگاہِ ناز سے بسمل ہوا

ہجر میں اخفائے رازِ عشق تھا کارِ محال
آنکھ سے جو اشک ٹپکا ترجمانِ دل ہوا

عشق نے قالب بنایا روح پھونکی درد نے
جوشِ بیتابی تسلی سے رُکا اور دل ہوا

اس محیطِ عشق میں جس کا کنارہ ہی نہ تھا
ڈوب کر اُبھرا تو اوروں کے لئے ساحل ہوا

اپنی تصویروں سے خود آراستہ اک بزم کی
دل میں کیا آئی کہ پھر برہم زنِ محفل ہوا

اک نگاہِ واپسیں اُس سے بہت کچھ کہہ گئی
پھر بھی اس حُسنِ بلاغت کا نہ وہ قائل ہوا

رنگِ محفل دیکھ کر سانس اپنی میں نے روک لی
جب کہیں خلوت سرائے خاص میں داخل ہوا

تو بھی رہنا شاہد اے پچھلے پہر کی خامشی
کشتۂ ضبطِ محبت جس طرح غافل ہوا

دیکھ لو حسرت بھری آنکھوں کو سرکا کر کفن
اب تو شاید مرنے والا رحم کے قابل ہوا

گلشنِ ہستی ہے میرے واسطے زنداں عزیزؔ
سرو کی مانند آزادی میں پا در گل ہوا

عزیز لکھنوی

علم الہیئت الجدیدہ

(۲)

کرۂ زمین

ہر چند کرۂ زمین، آفتاب سے باعتبار بُعد کے تیسرے درجہ کا سیارہ ہے (یعنی دو سیارے عطارد اور زہرہ بہ نسبت زمین کے آفتاب سے زیادہ قریب ہیں)، لیکن دوسرے سیاروں کی نسبت سے، اس لحاظ سے کہ یہ آفتاب سے نہایت معتدل فاصلہ پر واقع ہوا ہے اور اس کا مزاج آفرینش کے بہترین نتائج کے لئے موزوں ہے، تمام اجرام سماوی میں نہایت اہم کرہ ہے۔ چونکہ کرۂ ارض ہمارا مسکن ہے اور یہی ہماری آخری خوابگاہ، اسلئے ہم اس کی ہیئت و حرکت، طبیعت و مزاج، خشکی و تری، نشیب و فراز، کثافت مادہ، ثقلِ نوعی وغیرہ سے بخوبی آگاہ ہیں اور اس قدر مختلف علوم، اس سلسلہ میں مدوّن ہوگئے ہیں کہ آج اُنکا استقصا بھی مشکل ہے، انہی علوم میں سے ایک علم ہیئت ہے، جو صرف اک کرہ ہونیکی حیثیت سے اس کے مختلف حالات و کیفیات سے بحث کرتا ہے۔

ہیئت زمین مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں ہیئت زمین کے متعلق عجیب عجیب خیالات قایم کئے گئے ہیں، متقدمین کی تحقیقات، جو صرف ان کے قیاس پر قائم تھی آج بالکل باطل خیال کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم زمین کے متعلق جدید ترین تحقیقات پیش کریں، قدیم خیالات کا ظاہر کردینا بھی مناسب ہے تاکہ اس سے اندازہ ہوسکے کہ انسان کس طرح علوم و فنون کے ابتدائی مدارج طے کرکے منتہائے کمال تک پہنچتا ہے

قدما کی زمین زمین کی نسبت قدما کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ بعض کہتے تھے، زمین ایک دائرے کی صورت ہے، بعض اُسے بالکل مسطح سمجھتے تھے، بعض کا خیال تھا کہ اس کی شکل ایک ستون کی طرح ہے، بعض کا قول تھا کہ وہ طبل نما ہے، بعض اُسے ایک کشتی سے تشبیہ دیتے تھے، بعض کے نزدیک زمین ایک بلند پہاڑ تھی، جس کے دامن بہت زیادہ پھیلے ہوئے تھے، بعض حکمائے یونان وغیرہ کی تحقیق یہ تھی کہ زمین کروی شکل رکھتی ہے۔

زمین کی کیفیتِ تکوین اور تخلیق کے متعلق اُن کے قیاسات کم حیرت انگیز نہ تھے، کلدانی کہتے تھے کہ زمین پر ابتدا میں صرف پانی تھا اور تاریکی، پھر اس میں عجیب و غریب شکل و صورت کے حیوانات پیدا ہوئے ان میں بعض انسان کی صورت پر بھی تھے، جن کے دو منہ، دو سر اور چار بازو ہوتے تھے، بعض میں تذکیر و تانیث

کی دونوں صفتیں جمع تھیں، ایسے آدمی بھی تھے جن کے کھُر اور سینگ ہوتے تھے، بعض ایسے تھے کہ اُن کا چہرہ تو آدمی کی طرح تھا، مگر نیچے کا جسم گھوڑے سے مشابہ تھا، ایسے آدمی بھی تھے جن کا چہرہ گھوڑے اور کتے کے مانند تھا، ان کے علاوہ اس پانی میں عظیم الشان مچھلیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ یہ تمام عجیب الخلقت مخلوقات ایک عورت کے تابع تھیں جسکا نام "اموکا" (یعنی سمندر) تھا۔ الغرض زمین انھیں عجایب سے معمور ہو رہی تھی کہ اسی اثنا میں معبود بلوس ظاہر ہوا، اس نے زمین کے دو حصے کر دیئے، جس سے آسمان اور زمین، سورج اور چاند وغیرہ پیدا ہوگئے، چونکہ یہ مخلوقات تاریکی کی خوگر تھیں اس لئے روشنی کو برداشت نہ کر سکیں اور فنا ہوگئیں، اس کے بعد بلوس نے دیکھا کہ زمین بالکل ویران ہے اور وہ آبادی کی صلاحیت رکھتی ہے، اس لئے اس نے ایک دیوی کو حکم دیا کہ میرا سر کاٹ لیا جائے اور میرے خون سے مٹی کو گوندھ کر اس سے انسان اور حیوانات وغیرہ بنائے جائیں، تاکہ وہ روشنی کو برداشت کر سکیں۔ چنانچہ اس طرح انسان کی پیدائش ہوئی اور چونکہ اس میں معبود کا خون شامل ہے اس لئے وہ بہ نسبت تمام حیوانات کے عقل و ادراک کا مادہ اس میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

ہندوؤں کا اعتقاد ہندوؤں کا اعتقاد تھا کہ برہما سب سے بڑا معبود ہے، جس کا وقت زیادہ تر خواب میں بسر ہوتا ہے اور صرف تھوڑی دیر کے لئے بیدار ہو کر پھر سو جاتا ہے، ایک مرتبہ وہ بیدار ہوا تو اُس کے مُنہ سے کروڑوں معبود نکلنے شروع ہوئے اور اُن کے ساتھ ہی دقائق ہیولیٰ (Particles of matter) بھی خارج ہوئے جن سے زمین، چاند، سورج اور ستارے بنے ہیں، لیکن چونکہ اول اول یہ تمام دقائق غیر مرتب تھے اس لئے برہما نے ایک بڑا انڈا بنایا اور تمام دقائق کے ساتھ اس میں داخل ہو گیا۔ چار ارب سال تک اس میں رہنے کے بعد پھر اس میں سے نکلا، اس وقت برہما کے ہزار سر، ہزار آنکھیں اور ہزار ہاتھ تھے، برہما نے اپنے ساتھ دقائق کو بھی نکالا۔ اور ایک کو دوسرے سے الگ کیا۔ جس سے موجودہ دنیا بن گئی۔

ہندوؤں کے نزدیک دنیا کے ۱۴ طبقے ہیں۔ سات زمین کے نیچے اور چھ اوپر۔ زمین کو وہ مسطح خیال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سات جزیروں سے مرکب ہے اور درمیان کے جزیرہ میں انسان رہتا ہے، وہ کہتے تھے کہ اس جزیرے کے گرد کھارے پانی کا سمندر ہے، باقی جزیروں میں سے کسی کے گرد گھی، کسی کے گرد دودھ، دہی، گنے کا رس، اور کسی کے گرد خالص پانی پایا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمین کے نیچے کے طبقوں میں ناپاک مخلوق رہتی ہے اور اوپر کے طبقہ میں علاوہ پاک مخلوق کے بہت سے دیوتا بھی سکونت پذیر ہیں۔

یونانیوں کا خیال مسیح علیہ السلام سے آٹھ صدی پہلے یونانیوں کا خیال تھا کہ آسمان کی نیلگوں سطح وہاں کی

زمین کا رنگ ہے جہاں معبود رہتے ہیں اور وہ زمین جس پر انسان رہتا ہے مسطح ہے اور اس کے گرد سمندر ہے۔ شب و روز کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ آسمانی قوت آفتاب اور ستاروں کو مشرق سے نکال کر آہستہ آہستہ نہایت دشواری سے آسمان میں چڑھاتی ہے اور وہ پھر مغرب میں نہایت سرعت اور آسانی کے ساتھ غروب ہو جاتے ہیں۔

یونانیوں نے زمین کی صرف سطح ظاہری ہی کا حال بیان نہیں کیا، بلکہ طبقات زیر زمین کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ زمین کے نیچے ایک دائمی تاریکی ہے جہاں بادشاہ بلوتون تاریکی کے تخت پر ظلمت افروز ہے۔ اس کے سر پر ہاتھی دانت کا تاج ہے اور وہ اپنے نیچے اُن ظلمات کو دیکھ رہا ہے جنھیں انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اُنکا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ تاریکیاں مردوں کی روحوں کا مستقر ہیں، جن کا دروازہ غروب آفتاب کی جگہ قایم ہے۔ دروازے کے پاس بہت سے گروہ ارواح کے سکونت پذیر ہیں، جن سے رنج، غم، مرض، بڑھاپا، فقر، خوف، بھوک، لڑائی، تکلیف اور موت صادر ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ وہاں عجیب و غریب قسم کے حیوانات بھی ہیں۔ وہاں ایک پانی کا سمندر ہے اور ایک آگ کا، جس میں شعلوں کی موجیں بلند ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مجرم اسی آگ کے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔

عبرانیوں کا خیال تھا کہ زمین مرکز عالم ہے اور آفتاب مع تمام ستاروں کے زمین ہی کیلئے پیدا کیا گیا ہے وہ سمجھتے تھے کہ آسمان ستونوں کے سہارے پر قایم ہے اور وہ ستون اطراف زمین پر نصب ہیں (ایوب ۲۶-۱۱) آسمان کے اوپر بھی پانی ہے (مزامیر ۱۴۸-۴) وہ کہتے تھے کہ آسمان کرۂ زمین پر ایک خیمہ کی طرح قایم ہے (اشعیا ۴۰-۲۲) جسکی پیدائش زمین سے ایک روز بعد ہوئی ہے (تکوین ۱-۶) اُن کا خیال تھا کہ آسمان میں جا بجا پانی برسنے کے لئے نالیاں اور سوراخ ہیں (تکوین ۷-۱۱ اشعیا ۲۴-۱۸ مزامیر ۷۸-۲۳) کائنات فلکی کی بقا زمین کی بقا کے ساتھ وابستہ ہے، جس روز زمین فنا ہوگی وہ بھی فنا ہو جائیگی، اُن کا اعتقاد تھا کہ زمین ایک بڑی سطح ہے جو ستونوں پر قائم ہے (ایوب ۹-۶ مزامیر ۷۵-۳) اور خدا نے اُسے پانی پر بچھایا ہے (مزامیر ۲۴-۲) زمین کے نیچے وہ ایک عظیم الشان تاریکی کے بھی قائل تھے۔

ازمنۂ وسطےٰ کے خیالات قرون متوسطہ کے لوگوں نے زمین کے متعلق اپنے بہت سے معتقدات انہیں متقدمین سے اخذ کئے اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔

عربوں نے چونکہ ازمنۂ وسطےٰ میں ترقی کی ہے اس لئے یہی زمانہ اُن کے علوم و فنون کی اعلیٰ ترقی کا ہے، و لیکن ان میں بھی دو قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں، جن لوگوں نے قدما کا تتبع کیا ہے، وہ تو اسی قسم کے اوہام

اور خرافات میں مبتلا ہوگئے ہیں اور جنہوں نے علم اور فلسفہ میں ترقی کی ہے وہ حقیقت کے قریب پہنچ گئے ہیں، چنانچہ علامہ ابن خلدون اور دیگر مسلمان فلاسفہ نے تصریح کی ہے کہ زمین کی شکل کروی ہے۔

جاہلیت عرب قرمانی کہتا ہے کہ "جب خدا نے زمین کو پیدا کیا تو اُس نے عرش کے نیچے سے ایک فرشتہ بھیجا، جو ساتوں زمینوں کے نیچے پہنچ گیا۔ اُس نے زمین کو اپنے شانوں پر رکھ لیا، اُس کا ایک ہاتھ مشرق میں اور دوسرا ہاتھ مغرب میں تھا، لیکن اُس کے پاؤں کے لئے کوئی جائے قرار نہ تھی، اس لئے خدا نے جنت سے ایک بیل بھیجا، لیکن اس کی پیٹھ پر بھی فرشتہ کے پاؤں نہ جم سکے، اس لئے پھر فردوس سے ایک یاقوت بھیجا جس کا قطر پانسو برس کی راہ کے برابر تھا، وہ یاقوت بیل کی پیٹھ پر رکھا گیا اور اس کے اوپر فرشتہ کے پاؤں جم گئے، اس بیل کے چار سینگ ہیں جو زمین کے چاروں طرف نکلے ہوئے ہیں، اُس کے نتھنوں سے جو ہوا پیدا ہوتی ہے اس سے سمندر میں مدوجزر ہوتا ہے، بیل کے پاؤں کے لئے بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا اس لئے آسمان و زمین کے برابر ایک سبز چٹان پیدا کی گئی اور اس پر بیل کے پاؤں رکھے گئے اور چٹان ایک بڑی مچھلی کی پیٹھ پر رکھی گئی، مچھلی سمندر پر قائم ہے اور سمندر ہوا پر ہے اور ہوا خدا کی قدرت پر ہے"

اس قسم کی اور بہت سی خرافات اور لغویات عربوں سے منقول ہیں۔

حکمائے اسلام قزوینی لکھتا ہے کہ "زمین کی شکل تقریباً کروی ہے اور وہ افلاک کے مرکز پر واقع ہے پانی اور ہوا ہر طرف سے اس پر محیط ہے اور جو حصہ خشک رہ گیا ہے وہ حیوانات کا مسکن ہے بعض کہتے ہیں کہ زمین بالکل مسطح ہے، بعض کا خیال ہے کہ وہ ڈھال کی طرح ہے بعض اُسے طبل کی طرح بتاتے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ایک مدور کرہ ہے اور وہ بغیر کسی علاقہ اور ستونوں کے وسط میں قائم ہے"

امام ابن اثیر تحفۃ العجائب میں لکھتے ہیں کہ "زمین پر انسان جہاں کہیں کھڑا ہو، اس کا سر ہمیشہ آسمانی طرف رہتا ہے اور اُسے ہر جگہ سے نصف آسمان نظر آتا ہے اور ہر ۱۹ فرسخ چلنے پر ایک درجہ آسمان کا نظر آنے لگتا ہے اور جس طرف سے چلا تھا اس طرف کا ایک درجہ چھپ جاتا ہے، لوگوں نے ایک ہی خسوف کو مختلف بلاد میں مختلف اوقات میں مشاہدہ کیا ہے، اگر چاند کا طلوع تمام ملکوں میں ایک وقت ہوتا تو یہ اختلاف بھی نہ ہوتا۔

خلیفہ مامون رشید نے بھی دو جگہ ایک مسطح میدان میں ایک درجہ ارضی کی پیمائش کرائی تھی، اور ارتفاع قطب شمالی سے معلوم کر لیا تھا کہ زمین کروی شکل کی ہے۔

کرویت زمین کا خیال ولادت مسیحؑ سے چھ صدی قبل پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اُسے بالکل چپٹا

سمجھتے تھے۔

قرونِ متوسطہ کی ابتدا میں یورپ اپنی جہالت کی وجہ سے علومِ عرب کو سخت بدعت سمجھتا تھا اور اُن کے رواج دینے والوں پر کفر والحاد کے فتوے صادر کرتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یورپ نے مسلمانوں سے علمِ ہیئت سیکھا اور اپنے ملک میں اس کی اشاعت شروع کی، ہر چند ابتدا میں سخت مشکلات کا سامنا ہوا اور شدید مخالفت کی گئی، لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔

قدماء کا خیال تھا کہ زمین کائنات کا عظیم ترین حصہ ہے، اس کے گرد آفتاب اور تمام سیارے حرکت کرتے ہیں اور یہ سب کچھ انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن جب انھوں نے عربوں سے علمِ ہیئت اور ہندسہ وغیرہ سیکھا تو وہ زمین کو ایک حقیر کرہ سمجھنے لگے اور بمقابلہ دوسرے اجرامِ سماوی کے اُسے بہت معمولی کرہ خیال کرنے لگے۔

علاوہ اس کے اُن میں یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ زمین کی دو حرکتیں ہیں، ایک اپنے محور پر اور دوسری آفتاب کے گرد۔

چودھویں صدی عیسوی میں کرڈینال پیدا ہوا، جس نے فیثاغورث کی تعلیمات کو زندہ کیا، ہنری ثالث شاہ فرانس کے زمانہ میں (ماموں سے سات صدی بعد) ایک درجہ ارضی کی پیمائش پیرس کے شمال میں کی گئی، جس سے ثابت ہو گیا کہ زمین ایک کرہ ہے اور اس کا محیط ۲۴۸۴۰ اطالوی میل ہے۔

چودھویں صدی سے لیکر آخر زمانہ تک یورپ میں متعدد حکماء اور علمائے ہیئت پیدا ہوئے اور سب کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ زمین ایک کرہ ہے، اور دوسرے سیاروں کی طرح وہ بھی نظامِ شمسی کا ایک رکن ہے جو آفتاب کے گرد حرکت کرتا ہے۔ ابتدا میں ان غریبوں کی سخت مخالفتیں ہوئیں بعض مارے گئے، بعض کو سخت سزائیں دی گئیں، لیکن آخر میں علمی طاقت جہل پر غالب آگئی اور حقائق ثابتہ روزِ روشن کی طرح ظاہر و واضح ہو گئے۔

تحقیقاتِ جدیدہ جدید تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ زمین نظامِ شمسی کا ایک سیارہ ہے، جو بظاہر وسطِ فلک میں نہایت سکون کے ساتھ قایم نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ نہایت سرعت کے ساتھ فضا میں گردش کر رہا ہے، زمین نہ ستونوں پر قایم ہے نہ زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے، بلکہ اپنے تمام متعلقات کو لئے ہوئے فضا میں ایکہزار میل فی منٹ سے زیادہ سرعت کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ زمین حقیقی کرہ نہیں ہے بلکہ قطبین کے پاس کچھ مسطح ہو گئی ہے، اس لئے اس کی صورت نارنگی سے مشابہ ہے۔

زمین کے گول ہونیکے بہت سے دلائل ہیں مثلاً (۱) اگر ہم ایک جگہ سے سیدھے چلیں تو پھر وہیں آ جائینگے۔

(۲) جس قدر ہم شمال کی طرف بڑھتے جائیں گے، ہمیں نئے نئے ستارے نظر آئیں گے اور جنوب کی طرف کے ستارے چھپتے جائیں گے (۳) سمندر میں پہلے جہاز کا مستول نظر آتا ہے، پھر رفتہ رفتہ پورا جہاز نظر آنے لگتا ہے (۴) ہر شہر کا وقت الگ ہے (۵) مشرقی شہروں میں آفتاب بہ نسبت مغربی کے پہلے نکلتا اور پہلے ڈوبتا ہے (۶) خسوف کے وقت جب زمین کا سایہ چاند پر پڑتا ہے تو وہ بھی گول ہی ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں زمین کے گول ہونے پر نہایت وضاحت سے دلالت کرتی ہیں۔ کرویت زمین کا مسئلہ چونکہ اظہر من الشمس ہو چکا ہے اس لئے ہم اسے تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتے۔

زمین اور دوسرے سیارے زمین بہ لحاظ بُعد، تیسرے درجہ کا سیارہ ہے یعنی سب سے پہلے عطارد پھر زہرہ پھر زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے زمین کے بعد مریخ، مشتری، وغیرہ متحرک ہیں۔

زمین کی حرکات زمین کی متعدد حرکتیں ہیں جن میں سے ایک سالانہ حرکت ہے جو آفتاب کے گرد ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۱۵ سیکنڈ میں ختم ہوتی ہے، زمین کی حرکت سے جو مدار پیدا ہوتا ہے اُسے دائرۃ البروج کہتے ہیں، اس دائرہ کی سطح خط استوا کی سطح سے ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ ۱۲ ثانیہ مائل ہے، اس میلان کی وجہ سے دائرۃ البروج کے دو حصے ہو گئے ہیں، ایک خطِ استوا سے شمالی اور دوسرا جنوبی، اس دائرہ کے بارہ حصے کئے گئے ہیں اور ہر حصہ برج کہلاتا ہے، دائرۃ البروج کے شمالی قوس میں حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ اور جنوبی قوس میں، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت واقع ہیں، جس برج میں زمین ہوتی ہے آفتاب اس کے مقابل برج میں آسمان پر نظر آتا ہے۔ مثلاً اگر زمین حمل میں ہے تو آفتاب میزان میں نظر آئیگا۔

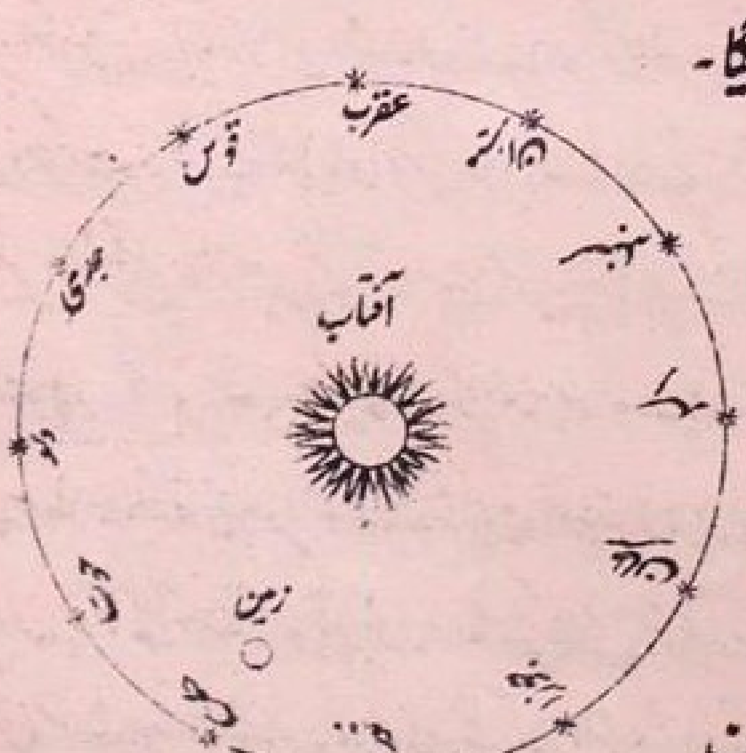

جو لوگ علم ہیئت سے واقف نہیں ہیں، انہیں سخت تعجب ہوگا کہ زمین کا شمار اجرام فلکی میں کس طرح کیا گیا، کیونکہ زمین (ان کے نزدیک) ایک بڑا کرہ ہے، جس کے حدود معلوم ہیں اور ستارے چھوٹے چھوٹے روشن نقطے ہیں۔ زمین پر ہم نہایت سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی قسم کی حرکت محسوس نہیں ہوتی، اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف متحرک نظر آتے ہیں، چنانچہ انہی ظاہری حالات نے قدما کو (سوائے چند صاحب ادراک فلاسفہ کے) اس بات کا قائل کر دیا کہ زمین بالکل ساکن ہے اور اجرام فلکی سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن واقعہ اسکے

برعکس ہے زمین روزانہ اپنے محور پر اور سالانہ آفتاب کے گرد حرکت کرتی رہتی ہے۔

یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ ہمیں حرکتِ زمین کا احساس نہیں ہوتا، کیونکہ ہم اور زمین اور اس کے تمام متعلقات ایک نسبت سے متحرک ہیں، خشکی، سمندر، پہاڑ، میدان، شہر، گانوں، قصبے، جنگل، صحرا، ہوا، ابر غرض زمین پر جس قدر کائنات ہے زمین کے ساتھ متحرک ہے، حرکت کا احساس تو اس وقت ہوتا کہ بعض چیزیں متحرک ہوتیں اور بعض ساکن، اس وقت ساکن اشیاء کے مقابلہ سے حرکت محسوس ہو سکتی، یا یہ کہ زمین اپنی حرکت میں کسی دوسری چیز سے ٹکراتی یا اس کی حرکت میں ارتعاش و اہتزاز ہوتا لیکن ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔ زمین اپنے کرۂ ہوائی کے ساتھ جو ہر طرف سے محیط ہے ایک وسیع فضا میں اپنے مدار پر حرکت کر رہی ہے۔ فضا میں ہر طرف ایتھر پھیلا ہوا ہے جو ہوا سے ہزار ہا درجہ زیادہ لطیف ہے اس لئے ہوا کے ساتھ اس کا تصادم نہیں ہوتا، چونکہ دوران حرکت میں نہ کسی چیز سے تصادم ہوتا ہے نہ اور ایسا ہے کہ بعض چیزیں ساکن ہوں اور بعض متحرک، اس لئے ہمیں حرکت کا مطلق علم نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ ستارے مشرق سے مغرب کی طرف متحرک نظر آتے ہیں۔

اگر ہم ریل میں آنکھ بند کر کے بیٹھ جائیں، تو حرکت مطلق محسوس نہ ہوگی البتہ راستہ کے نشیب و فراز یا گاڑیوں کی خرابی سے جو تزلزل پیدا ہوتا ہے اُس کا احساس ضرور ہوگا اور جس قدر راستہ عمدہ اور گاڑیاں چست ہونگی یہ احساس کم ہوتا جائیگا۔ ریل پٹری پر حرکت کرتی ہے، لیکن ہوائی جہاز ہوا پر چلتا ہے اس لئے اس میں یہ بہت ہی کم ہو جاتا ہے بلکہ بعض وقت بالکل نہیں ہوتا، اسی طرح کشتی میں بھی حرکت محسوس نہیں ہوتی (جبکہ دریا میں تلاطم نہ ہو) بلکہ کنارے کے درخت اور چیزیں متحرک نظر آتی ہیں۔ بڑے بڑے جہاز جن پر معمولی سا تلاطم کچھ اثر نہیں ڈالتا اپنے تمام لوازم کے ساتھ حرکت کرتے ہیں، لیکن اُنکے اندر ذرا بھی حرکت محسوس نہیں ہوتی، ہر شخص اُن میں چلتا پھرتا ہے، لکھتا پڑھتا ہے، غرض خشکی کی طرح تمام کاروبار ہوتے ہیں۔ اگر متحرک ریل یا جہاز میں گیند اوپر کو پھینکی جائے تو وہ سیدھی اسی جگہ گرتی ہے جہاں سے پھینکی گئی ہے۔

حرکتِ زمین پر متعدد دلائل ہیں، منجملہ اُن کے ایک مسئلہ انحرافِ نور ہے یعنی جب کسی ستارہ یا آفتاب کی روشنی زمین پر پہنچتی ہے، تو وہ عمودی نہیں ہوتی بلکہ اس میں انحراف ہوتا ہے جو حرکت زمین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، کیونکہ روشنی کو زمین تک پہنچنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس عرصہ میں زمین اپنے مدار پر آگے بڑھ جاتی ہے، اس سے شعاع نور بجائے عمودی ہونے کے منحرف پڑتی ہے، اس انحراف کا نتیجہ ہے کہ ہم آفتاب اور

ستاروں کو اُن کی اصلی جگہ سے ہٹے ہوئے دیکھتے ہیں اگر زمین حرکت نہ کرتی تو یہ صورت کس طرح واقع ہو سکتی تھی۔

آج کل چند آلات بھی ایسے بنائے گئے ہیں جن سے زمین کی حرکت کا عینی مشاہدہ ہو سکتا ہے۔

نگار کی اشاعتِ اولین میں ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ کیونکر ہر شخص خود حرکت زمین کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے، علاوہ اس کے حرکت زمین پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ گھڑی کا رقّاص (پینڈولم) خطِ استوا پر یا اس کے قریب زیادہ حرکت کرتا ہے اور جس قدر شمال یا جنوب کو جاؤ اس کی حرکت کم ہوتی جاتی ہے، مثلاً اگر رقّاص خطِ استوا پر ایک منٹ میں ۱۴۴ مرتبہ حرکت کرتا ہے تو پیرس میں ۱۲۰ دفعہ اور اسی طرح جس قدر شمال کی طرف جائیں گے حرکت کم ہوتی جائیگی، ایسا کیوں ہوتا ہے یہ حقیقت دو مقدموں کو ذہن نشین کرنیکے بعد واضح ہو سکتی ہے۔

زمین میں دو قوتیں ہیں، ایک جاذب المرکز، دوسری دافع المرکز۔

جاذب المرکز وہ قوت ہے، جس کی وجہ سے تمام اجسام، مرکز کی طرف کھنچتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں اُسے کششِ ثقل یا کششِ زمین کہتے ہیں۔

اگر کسی کرہ کو حرکت دی جائے تو ظاہر ہے کہ یہ حرکت وسط میں زیادہ ہو گی اور اطراف میں کم ہوتے ہوتے قطبین پر بالکل معدوم ہو جائیگی۔

اگر کسی ایسے کرہ کو حرکت دیں جس کے اجزا آپس میں اچھی طرح متصل نہ ہوں تو حرکت کرتے وقت اس سے اجزا منفصل ہوتے جائیں گے، کرہ کے درمیان میں چونکہ حرکت سریع ہو گی، اس لئے وہاں انفصال اجزا بھی زیادہ ہوگا۔ یہی قوت، جو اجزا کو مرکز سے دور کرتی ہے دافع المرکز کہلاتی ہے۔

اگر متحرک کرہ کے اجزا آپس میں خوب متصل ہیں تو حرکت کے وقت انفصال اجزا تو نہ ہوگا لیکن قوت دافع المرکز ضرور پائی جائے گی جو اجزا کو مرکز سے محیط کی طرف پھینکنے کی کوشش کرے گی۔

زمین بھی ایک متحرک کرہ ہے اس لئے اس میں بھی ان دونوں قوتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ جاذب المرکز قوتِ اجزا کو مرکز کی طرف کھینچتی ہے اور دافع المرکز محیط کی طرف پھینکنا چاہتی ہے۔ خطِ استوا پر چونکہ حرکت بہت زیادہ سریع ہے اس لئے وہاں دافع المرکز قوت زیادہ نمایاں ہے۔ اور اسی نسبت سے قوت جاذب المرکز کم رہی۔

پھر چونکہ چیزوں کا گرنا، یا رقّاص کا حرکت کرنا جاذبیت زمین کی وجہ سے ہے اور یہاں جاذبیت کم ہے، اس لئے رقّاص آزادی کے ساتھ دیر تک متحرک رہے گا۔ اور ایک منٹ میں زیادہ حرکت کرے گا۔ اور جس قدر خطِ استوا سے دور ہوتا جائے گا اُسی قدر زمین کی حرکت کم ہوتی جائے گی۔ اور اسی نسبت سے دافع المرکز طاقت کم ہو جائیگی

اور اشیا کا وزن بڑھتا جائیگا جو رقاص کی حرکت کو بھی کم کر دیگا۔

حرکتِ زمین کا دوسرا ثبوت

آفتاب، ماہتاب اور تمام ستارے چوبیس گھنٹے میں مشرق سے مغرب کی طرف گھوم جاتے ہیں اس حرکت کا سبب یا تو یہ ہوگا کہ یہ تمام اجرام زمین کے گرد روزانہ حرکت کرتے ہونگے یا زمین اپنے محور پر متحرک ہوگی، پہلی صورت عقل سے بہت ہی بعید ہے، اس لئے کہ سورج زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے اور بعض ستارے سورج سے بھی کئی ہزار گنا بڑے ہیں۔ اس لئے زمین میں وہ کون سی قوتِ مقناطیس ہے جو تمام لامتناہی اجرام فلکی کو اسکا عاشقِ زار بنا دیتی ہے، اور چوبیس گھنٹے میں ایک نسبت سے اس کے گرد گھوم جاتے ہیں۔ حالانکہ ان اجرام کثیر کے مقابلہ میں زمین کی اتنی بھی حقیقت نہیں ہے، جیسی ایک ریت کا دانہ افریقہ کے صحرائے اعظم میں۔ اس لئے لامحالہ یہی ماننا پڑیگا کہ زمین حرکت کرتی ہے۔

زمین کی حرکت کا تیسرا ثبوت

مریخ، مشتری، زحل، یورینس اور نیپتون، اپنے محور پر حرکت کرتے ہیں، یہ حرکات دوربین کے ذریعہ سے صاف نظر آتی ہیں علاوہ اس حرکت محوری کے یہ سیارے آفتاب کے گرد بھی حرکت کرتے ہیں اور یہ تمام حرکتیں قواعدِ ریاضی پر مبنی ہیں۔

عطارد اور زہرہ میں بھی یہ حرکتیں پائی جاتی ہیں اس لئے اگر ہم زمین کو متحرک نہ فرض کریں تو فضا میں اس کیلئے کوئی ایسا مقام فرض نہیں کر سکتے، جہاں سے تمام حرکات فلکی منضبط ہو جائیں، اسے تفصیلاً یوں سمجھنا چاہئے آفتاب سے سب سے زیادہ قریب سیارہ عطارد ہے اس کے بعد زہرہ پھر زمین، چونکہ عطارد اور زہرہ کا مدار زمین کے مدار کے درمیان واقع ہیں، اس لئے یہ دونوں سیارے کبھی ہمارے اور آفتاب کے درمیان میں آجاتے ہیں اور اس حالت کو اقترانِ اسفل کہتے ہیں۔ اور کبھی آفتاب ہمارے اور اُن کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ اقترانِ اعلیٰ کہلاتا ہے یہانتک کہ بعض اوقات یہ سیارے آفتاب کے قرص پر سے گذرتے ہوئے اور بعض وقت اس کے پیچھے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، زمین کے بعد مریخ اور مشتری وغیرہ کے حدود ہیں، چونکہ ان کے مدارات مدار زمین کے باہر ہیں اسلئے ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ یہ سیارے ہمارے اور آفتاب کے درمیان حائل ہو جائیں بلکہ آفتاب ہی ہمارے اور اُن کے درمیان حائل ہوتا ہے، اس لئے اُن میں ہمیشہ اقترانِ اعلیٰ ہوتا ہے اسفل نہیں ہوتا۔

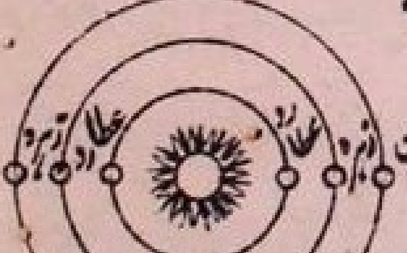

اگر زمین بھی نظامِ شمسی کا ایک رکن اور آفتاب کے گرد متحرک نہ ہوتی تو اقترانِ اعلیٰ اور اسفل کی توجیہ کسی طرح سمجھ میں نہ آسکتی۔

محور اور قطبین زمین کی تقسیم اور تعیین مواقع کے لئے علمائے ہیئت نے زمین پر متعدد خطوط فرض کئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم محور اور قطبین ہیں ان کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم ایک کروی چیز کے اندر کوئی آہنی سلاخ داخل کرکے اس کرہ کو گھمائیں تو وہ سلاخ اس کرہ کا محور ہوگی، اور اس کے دونوں سرے قطبین ہونگے۔ چونکہ زمین گول ہے، اس لئے شمال اور جنوب کے انتہائی نقطے قطبین ہیں، اور قطبین کے درمیان جو خط وہمی ہے وہی محور ہے۔

خطِ استوا خطِ استوا وہ خط ہے جس کے ذریعہ سے زمین کے برابر دو حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک شمالی اور دوسرا جنوبی۔ اس خط اور قطبین کے درمیان ہر جگہ سے بُعد برابر ہوتا ہے۔ اگر اسی خط کو ہم آسمان تک پھیلائیں تو بھی خط اعتدال کہلاتا ہے۔

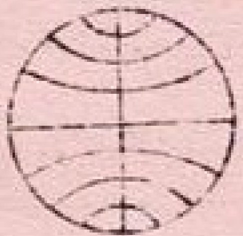

مدارِ زمین وہ دائرہ ہے جس پر وہ آفتاب کے گرد حرکت کرتی ہے اور اپنی گردش سے فضا میں جو دائرہ بناتی ہے وہ دائرۃ البروج کہلاتا ہے، زمین کا محور مدار زمین پر عمودی نہیں ہے بلکہ ۲۳ درجہ ۲۷ دقیقہ مائل ہے، اس میلان کا یہ نتیجہ ہے کہ اثنائے حرکت میں چھ مہینے تک قطب شمالی پر روشنی رہتی ہے اور چھ مہینے تک قطب جنوبی پر۔

اختلافِ موسم مدارِ زمین خطِ استوا سے ۲۳ درجہ ۲۷ دقیقہ مائل ہے اگر مدار زمین اور خط استوا ایک ہوتا تو تمام زمین پر ہمیشہ رات دن برابر رہتے اور آفتاب کی شعاعیں خط استوا پر ہمیشہ عمودی پڑتیں اور تمام دنیا میں ایک موسم رہتا، لیکن چونکہ قدرت کو اختلافِ موسم منظور تھا، اس لئے اس نے مدار زمین کو ۲۳-۲۷ مائل کر دیا۔ اسی میلان کا نتیجہ ہے کہ کبھی شعاعیں سیدھی اور کبھی ترچھی پڑتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں شعاعیں عمودی یا قریب عمودی کے ہوتی ہیں اور جاڑے کے موسم میں مائل ہو جاتی ہیں۔

موسم اور آفتاب و زمین کا تعلق آفتاب کا مدار زمین کے بالکل وسط میں نہیں ہے بلکہ مرکز سے ۳۰ لاکھ میل ہٹا ہوا ہے اس لئے زمین اپنی سالانہ گردش میں ایک مرتبہ آفتاب کے قریب اور ایک مرتبہ بعید ہو جاتی ہے۔

آفتاب زمین سے ۹ کروڑ ۲۸ لاکھ میل دور ہے اس لئے تیس لاکھ میل کا قرب و بعد حرارت کی کمی و زیادتی میں کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالتا، بلکہ حرارت کی کمی زیادتی صرف شعاعوں کے استقامت و عمودیت پر موقوف ہے، یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ گرمی کے موسم میں آفتاب بہ نسبت جاڑے کے ۳۰ لاکھ میل دور ہوتا ہے مگر شعاعوں کی سیدھی پڑ جانے سے حرارت بڑھ جاتی ہے۔

جس وقت زمین کے نصف کرہ شمال پر شعاعیں سیدھی پڑتی ہیں یا استقامت کی طرف قریب ہوتی ہیں۔

تو دوسرے نصف جنوبی حصہ میں ترچھی پڑتی ہیں اور جب نصف جنوبی میں سیدھی ہوتی ہیں تو نصف شمالی میں مائل ہو جاتی ہیں، اسی لئے کل زمین کا موسم ایک نہیں ہوتا بلکہ جب نصف شمال میں گرمی ہوتی ہے تو جنوبی میں جاڑا ہوتا ہے اور جب وہاں جاڑا ہوتا ہے تو نصف شمالی میں گرمی ہوتی ہے۔

منظر سماوی کا اختلاف چونکہ زمین اپنے مدار پر آفتاب کے گرد متحرک ہے اس لئے سال بھر تک ہر مہینہ میں رات کے وقت نئے ستارے نظر آتے ہیں۔ یہ بات ذیل کی صورت دیکھنے سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے جب

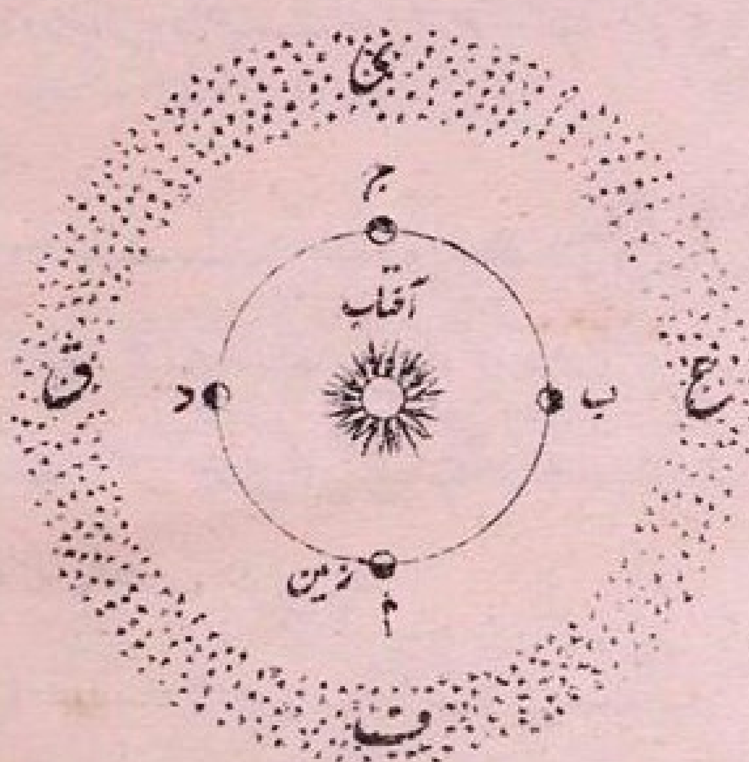

زمین الف سے بؔ تک حرکت کرے گی تو رات کے وقت قؔ اور عؔ کے درمیان جو ستارے ہیں نظر آئیں گے اور اس کے مقابل میں قؔ اور یؔ کے نظر نہ آئیں گے، ہمارے اور ان کے درمیان آفتاب حائل ہو جائے گا اور اس کی روشنی کی وجہ سے نظر نہ آئیں گے، اسی طرح جب زمین بؔ سے جؔ تک جائے گی تو عؔ اور یؔ کے درمیان کے ستارے دکھائی دیں گے اور مقابل جہت کے ستارے نظروں سے غائب رہیں گے۔

نیاز

خاموشیٔ ما گشت بدآموز بتاں را | زیں بیش وگرنہ اثرے بود فغاں را
در طبع بہار ایں ہمہ آشفتگی از چیست | گوئی کہ دل از بیم تو خوں گشت خزاں را
جستیم سراغِ چمنِ خلد بہ مستی | در گرد خرام تو رہ افتاد گماں را

(غالب مغفور)

بیوی کی امانت

سعید اپنے کمرے میں بیہوش پڑا تھا، اس طرح، جس طرح کوئی برسوں کا بیمار زندگی کی آخری ساعتوں میں بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ تین دن سے اس کی یہی حالت تھی، یہ تین دن، تین سال بلکہ تین صدیاں بن گئے تھے جو آہستہ آہستہ ختم ہو چکی تھیں اور اب اس کی زندگی صرف ایک آخری جھٹکے کا انتظار کر رہی تھی، جو اس تمام کشمکش کو ختم کر دے۔

اس سعید میں جو آج سے صرف تین روز پہلے اس مکان میں داخل ہوا اور اس سعید میں جو اس وقت یوں چارپائی پر پڑے پڑے موت کا انتظار کر رہا ہے، کتنا فرق تھا۔ تین روز کی بیماری نے (حالانکہ کوئی ایسی بیماری نہ تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا دل و دماغ کسی ناگہانی صدمہ کے فوری اثر سے متاثر ہو گیا تھا) سعید کو خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا۔ آہ، ان علم الابدان کے ماہروں کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ انسان صرف اُن اعضاء سے مرکب نہیں ہے جن کے باریک سے باریک رگ و ریشے سے وہ واقف ہیں، ہاں وہ نہ جان سکتے تھے کہ اس تمام عمارت کی بنیاد حقیقت میں اس نازک اور ناقابل فہم ہستی پر استوار ہے جو روح کے مبہم نام سے موسوم ہے۔

بے شک اس کا جسم بالکل صحیح تھا، اس کے اعضاء بالکل تندرست تھے مگر وہ سرچشمہ جس سے انسانی زندگی کو آبحیات ملتا ہے سوکھ چکا تھا، وہ حرارت جس سے یہ درخت پھل، پھول لاتا ہے ایک سرد خاموشی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اُس دن سعید کی صحت موت کو دعوت مقابلہ دینے کی اہل تھی، آج وہ زندگی سے ڈر رہا تھا۔ اس دن اس کی آنکھوں کے آئینوں میں امید کی جھلک تھی، آج وہ آئینے یاس کے تاریک بادلوں کی کثافت سے دھندلے ہو گئے تھے، اس دن اس کا دل ایک وصالِ منتظر کی آرزو سے متحرک تھا، آج اس دل کو ایک ابدی فراق کی سوزش نے ایک خاکسترِ مجسم، ایک داغ ناتمام بنا دیا تھا۔ اس دن وہ ایک پیکرِ حرکت تھا، آج ایک مجسمہ بے حسی۔ اس دن وہ ایک نغمۂ مضطرب تھا، آج ایک سکونِ منجمد، اس دن وہ ایک تمنائے بیقرار تھا، آج ایک حسرت دم بخود، اس دن اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر تھا جب وہ آج سے ساڑھے چار سال پہلے اپنی شادی کے صرف ایک مہینے بعد انگلستان جانے کے لئے اپنی بیوی

سے رخصت ہو رہا تھا، آج اس کی آنکھیں صرف اس منظر کو دیکھ سکتی تھیں، جب اس نے اپنی منتظر اور پُر امید بیوی کے نغمہ حیرت کی جگہ، اس کی تازہ موت کا ماتم سُنا تھا، اس دن وہ ان امیدوں، ان انتظاروں کو اُن کے سامنے سچا ہونے کے لئے گڈگڈا کر جگا رہا تھا، جس کو اس نے ہزاروں تسلیوں سے تھپک تھپک کر سُلا دیا تھا، آج وہ اس مایوسی اور ناکامی سے، جس نے اس امیدوں سے بھرے ہوئے انتظار، اس انتظاروں سے بھری ہوئی امید کو خودکشی کرنے پر آمادہ کیا تھا، ڈر ڈر کر غافل ہونا چاہتا تھا۔

ساڑھے چار سال گذرے، سعید بہت سی تمناؤں، بہت سے ارمانوں کو صرف ایک امید مستقبل سے مدہوش کرکے، اس بیاری چاہنے والی عورت کو ایک قابل برسرکار شوہر کی بیوی ہونے کے فخر و ناز سے سرشار کرنے، اپنی طبی تعلیم کو جسے اس نے ہندوستانی مدارس کے انتہائی مدارج تک حاصل کر لیا تھا، پایۂ تکمیل تک پہونچانے اور انگلستان کی اُس کاغذی سند کو قابو میں لانے کی غرض سے جس کے بغیر ہر قابلیت ہر لیاقت، جہالت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی، ولایت جانے کو طیار ہو گیا تھا۔ چار مکمل سال اس نے انگلستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں کس طرح گذارے۔ یہ اس کی نیند سے بیزار راتوں، دیوانگی شوق سے بیقرار دنوں پر خوب روشن تھا، وہ واپس آیا، انتظار اور ذوق کے ساڑھے چار سال بسر کرکے، اپنی تعلیم کو پورا کرکے، اپنی حسرتوں کو مکمل کرکے، مگر آہ کب جب وہ جس کے لئے یہ سب مصیبت جھیلی تھی، انتظار سے تنگ آکر اس سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکی تھی، امید کے دھوکوں سے نجات پاکر ایک ابدی مایوسی کی آغوش میں بیہوش ہو چکی تھی، کاش کہ اس کا جہاز صرف ایکدن پہلے پہنچ سکتا اور وہ اس مرنے والی کو اپنی آمد کے تار کی درستی کا یقین دلا سکتا۔ آہ اس زبان سے جواب ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی تھی صرف ایک لفظ سُن سکتا جس کو منہ سے نکالنے کے لئے شاید اس کو موت سے وہ جنگ کرنا پڑی تھی جو نزع کی جانکنی سے زیادہ مہیب، زیادہ روح فرسا، زیادہ صبر آزما تھی، جب یہ خیال اس کے دماغ کی آنکھوں کے سامنے آتا تو دنیا اس کے لئے تاریک ہو جاتی، وہ چار سال کی محنتِ شاقہ جو ایک تبسم مجسم تھی، ایک تذلیل بیلے حجاب بن جاتی، وہ کمال علم اس کو ایک زندہ ناکامی بن کر نظر آتا اور وہ اس وقت کو بددعائیں دیتا، جب اس نے ایک پُر آرزو، پُر ارمان، پُر حسرت، دلہن کو ایک آنے والی زندگی کی مسرتوں سے دھوکا دیا تھا اس کے خوفِ فراق سے سہمے ہوئے دل کو امید وصال سے تسلی دی تھی، ایک سامنے آئی ہوئی حقیقت کو ایک نظر سے دور خیال سے چھپانے کی کوشش کی تھی اس وقت وہ دل ہی دل میں چلا اُٹھتا "میں جاہل رہتا، نکما رہتا، مگر کاش کم از کم اپنی عمر کے یہ ساڑھے چار سال ان ارمانوں کے نذر کر دیتا جن کو ایک آرزوؤں کے

آبحیات سے پلی ہوئی جوانی میرے آغوش میں سپرد کر چکی تھی" اور جب اس خیال کی بیقراری کو اس کا ناتوان ونزار جسم برداشت نہ کر سکتا تو وہ کانپتا اس طرح، جس طرح بید کے درخت کی شاخیں کسی تند آندھی کے تھپیڑوں سے لرز اٹھتی ہیں، اس وقت اس کی آنکھوں کی پتلیاں اپنے حلقوں میں ایک پارۂ سیماب کی طرح ادھر ادھر بھٹکتیں اور اس کو جسے وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہیں نہ پا کر یخ بستہ قطرۂ آب کی طرح ساکن، منجمد اور خاموش ہو جاتیں۔ اس کی کوشش سے بند کئے ہوئے لبوں سے ایک آہ نکلی، گویا اس کی روح کا ایک ٹکڑا ہے کہ جسمانی زنجیروں کو توڑ کر نکل گیا۔

اب طبیبوں کے دماغ تھک گئے، دوائیں بے اثر ثابت ہو گئیں، خویش و اقارب، مایوس ہو گئے، ایک بوڑھے ڈاکٹر نے پہلے نبض پر ہاتھ رکھا، پھر ایک آلہ سے دل کی حرکت کو ٹٹولنا چاہا اور پھر اپنی نظروں کو عینک کے اوپر حلقوں سے بلند کر کے، سر کو ایک مایوس جنبش دی۔ کمرے میں سناٹا تھا، سب کے سر جھکے ہوئے تھے، سب کی بیقراری ایک آخری تسکین کو تلاش کر رہی تھی، بوڑھی انا جو سعید کی بچی کو ایک عورت کی زندہ وراثت کو ایک بیوی کی سب سے قیمتی امانت کو اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی، اٹھی سعید کے پلنگ کے پاس آئی اور اس معصوم بچی کو جو اس مہیب منظر سے اس قدر ہراساں ہو رہی تھی کہ کھل کے رو بھی نہ سکتی تھی، زانو پر بٹھا کر پچکار پچکار کے کہنے لگی "یہ ہیں تمہارے ابا جانی، بلاؤ نا، اپنے ابا کو پیار تو کرو" وہ اتنا ہی کہہ سکی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے، لڑکی نے اس طرح، جس طرح ایک رکا ہوا طوفان دفعتًا امڈ آتا ہے، اپنی معمولی آواز سے بہت زیادہ زور سے پکارا "ابا ابا جانی" یہ وہ الفاظ تھے جو اس نے اپنی ماں کی زبان سے سیکھے تھے یہ وہ الفاظ تھے جن سے پیار کرنے کی عادت اس نے اپنی ماں کے دودھ کے ایک ایک قطرے میں پی تھی، یہ وہ الفاظ تھے، جنکو انکے مدعا کو سمجھے انکے مخاطب کو دیکھے بغیر وہ اس وقت سے جب سے اس نے باتیں کرنا سیکھی تھیں، ہزار ہا بار دہرا چکی تھی۔

یہ ایک معصوم دل کے اعماق سے نکلی ہوئی آواز کیا تھی کہ وہ روح جو رخصت ہو چکی تھی تڑپ کر واپس لوٹی۔ سعید کا جسم ایک مہیب زلزلے سے مرتعش نظر آیا، جس کو دیکھنے والوں نے روح اور جسم کی آخری جنگ موت پر غالب آنیکے لئے زندگی کی آخری جد و جہد، بیماری کو زائل کرنیکے لئے قویٰ کی آخری کشمکش تصور کیا، یہ ایک حرکت تھی جو دل، دماغ اور آنکھوں میں یکساں موج زن ہوئی، سعید کی آنکھیں اس طرح کھلیں جس طرح کوئی ڈراؤنا، اور جانکاہ خواب کو دیکھ کر بیدار ہو رہا ہو، سعید کی پیشانی اس طرح پر چین و پر شکن ہوئی جس

طرح کوئی کسی بھولے ہوئے واقعے کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے، سعید کے ہاتھوں میں وہ تشنج پیدا ہوا جو کسی خوفناک اور زبردست دشمن کو مغلوب کر لینے کے بعد ایک کمزور فاتح کے جوش انتقام سے لبریز جسم میں پیدا ہوتا ہے، پھر یہ طوفان تھم گیا، یہ زلزلہ آہستہ آہستہ ایک پُر امن سکون میں تبدیل ہو گیا، اور باپ نے بہت آہستہ مگر اس آہستگی میں بلا کی سرعت نمایاں تھی، اپنی گردن بیٹی کی طرف پھرائی جو جواب کے انتظار میں حیران کھڑی تھی۔ اور پھر اپنی بھٹکی ہوئی نظروں سے، جس میں اس کی رہی سہی زندگی اس کی تمام روح مرکوز ہو گئی تھی اس کو دیکھا، جس کو وہ اس سے پہلے اس مادی پیکر میں نہ دیکھ سکا تھا اتنا نے اس امید افزا تبدیلی سے حوصلہ پاکر اور اپنے علاج کو طبیبوں کے علاج سے زیادہ موثر دیکھ کر بیٹی کو باپ کے پہلو میں لٹا دیا، وہ بے حس اور ناتوان بازو جو کسی قسم کی حرکت کے ناقابل معلوم ہوتے تھے، اپنی ہی گوشت و پوست کے ایک ٹکڑے کو اپنے مس کے لئے بیقرار محسوس کر کے اس کے ارد گرد لپٹ گئے، وہ روح جو اس کی مایوسیوں سے گھبرا کر جسم سے ناراض ہو گئی تھی، اپنے ہی ایک زندہ اور متحرک حصہ کو درد فرقت سے بیتاب دیکھ کر من گئی۔ اور اس حیات و ممات کی کشمکش میں جب اس کی آنکھوں سے ایک سیل اشک جاری تھا، جب اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا سعید کی آواز جس میں انتہائی ناتوانی کے باوجود ایک آہنیں عزم کی لرزش موجود تھی، سُنائی دی، میں زندہ رہونگا" میری ثریا کی امانت! میں تیرے لئے زندہ رہونگا"

حکیم احمد شجاع (بی۔ اے)

خرگوش ملیریا سے بچاتا ہے ایک مدت تک علمائے حفظ صحت اس مسئلہ پر غور کرتے رہے کہ ملیریا کے حملوں سے کس طرح انسان کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے، متعدد تجربات کے بعد ایک عجیب و غریب انکشاف ہوا کہ جس جگہ خرگوش کثرت سے پائے جائیں وہاں انسان اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتا کیونکہ ملیریا کا بخار ایک خاص قسم کے مچھر کے ذریعہ سے انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے اس مچھر کو علمی اصطلاح میں انوفلیس (Anopheles) کہتے ہیں یہ مچھر بہ نسبت انسانی گوشت کے خرگوش کو زیادہ ترجیح دیتا ہے بلکہ اور جانوروں کے مقابلہ میں اسی کو اپنا شکار بنانا زیادہ پسند کرتا ہے اس لئے یورپ کے جن شہروں میں یہ جانور کثرت سے پایا جاتا ہے وہاں انسان اس مرض سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے۔ فرانس میں اس مقصد کے لئے خاص طور پر خرگوش پالے جاتے ہیں۔ اور وہاں ان سے نہایت مفید نتیجہ نکلا ہے۔

اشتراکیت حربی

(نظامِ حکومت و اقتصاد جنگ کے زمانہ میں)

یورپ کی جنگ عظیم نے، سلطنتوں کے جن قوانین اور اصولِ حکمرانی میں ایک زبردست تغیر و انقلاب پیدا کیا ہے، انہیں میں اشتراکیتِ حربی کا مسئلہ بھی ہے۔ یوں تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ جنگ میں تمام اصولِ اشتراک و تعاون کو درہم و برہم ہو جانا چاہیئے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، اور اقتصادی ضروریات نے اب سلطنتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ حالتِ جنگ میں بھی اشتراکیت کے اصول پر عمل کریں تاکہ ایسے نازک موقعہ پر "عمل و اجرت" کے نظام میں خلل واقع نہ ہو اور لوگوں کی زندگی دشوار نہ ہو جائے۔

حالتِ جنگ میں اس قسم کا اشتراکی نظام قایم کرنے کی ضرورت اس لئے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ کہیں جنگی خلفشار و حربی اضطراب کی حالت میں پبلک کا انبساط و استحکام قومی معدوم نہ ہو جائے اور ایسے نازک موقع پر کسی عنصر کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

سب سے پہلے جرمنی نے اس طرف پیشقدمی کی، کیونکہ اس کی عظیم الشان فوجی طاقت نے جس کیلئے کسی قانون کا پابند ہونا ضروری نہ تھا اور اس کے لاتعداد صناعی شعبوں نے ان اصول کے اجرا میں اسکے لئے بڑی حد تک آسانیاں بہم پہونچا دی تھیں۔

جرمنی نے جنگ شروع ہوتے ہی تمام طبقۂ عاملہ کو (جس میں عورت مرد سب شامل تھے) نظامِ عسکری کی ماتحت بنا دیا اور تقسیمِ عمل و تعیینِ اجرت، دونوں کو فوج کے ہاتھ میں دیدیا۔ جس شخص میں جس کام کی اہلیت و صلاحیت ہوتی تھی، اس سے وہی کام لیا جاتا تھا اور مناسب اجرت دی جاتی تھی، جو شخص ہتھیار اٹھانیکے قابل تھا اسے فوج میں لے لیا جاتا تھا، اور جس میں یہ قابلیت نہ تھی اس کی مہارت و تجربہ کے لحاظ سے کوئی کام سپرد کر دیا جاتا تھا، لیکن تقسیمِ اجرت میں انصاف اور مساوات کا پہلو حتی الامکان نظرانداز نہیں کیا جاتا تھا۔

برطانیہ کی وزارتِ جنگ نے بھی جرمنی کی تقلید میں مذکورہ بالا اصول کو اختیار کیا اور ایک حد تک اس پر عمل بھی کیا گیا۔

مصارفِ جنگ کی حقیقت اشتراکیتِ حربی کو ذہن نشین کرنے کیلئے ضرورت ہے کہ پہلے اس مسئلہ پر مالی

حیثیت سے نظر ڈالی جائے۔

برطانیہ نے اس جنگ میں تین ملیار ڈپونڈ سے زیادہ صرف کئے۔ ۳ ملیار ڈپونڈ تین سو چھپن ٹن سونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے اس حساب کو دیکھتے ہوئے سخت حیرت ہوتی ہے کہ برطانیہ کے پاس اتنی بڑی مقدار میں سونا کہاں سے آیا؟

کرنسی نوٹ اس کا جواب یہ ہے کہ سلطنت کے پاس اس قدر عظیم مقدار میں زر خالص موجود رہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب تک دنیا میں عام نظام اقتصاد قایم ہے، جبتک بنک اپنا کام کر رہے ہیں اور نوٹ، سونے کے سکے کی طرح چل رہے ہیں، اس وقت تک یہ ضرورت پیش نہیں آتی جس طرح حکومت کی طرف سے سکہ ضرب کیا جاتا ہے اسی طرح نوٹوں کا اجرا بھی اس کے لئے بالکل آسان ہے، لیکن اس کے لئے یہ بیشک ضروری ہے کہ جس قدر نوٹ جاری کئے جائیں اُنکی قیمت کے برابر مسکوک یا غیر مسکوک سونا، حکومت کے خزانہ میں موجود ہو۔ اگر ضرورتاً نوٹوں کی تعداد بڑھادی جائے اور اُن کی قیمت کا سونا حکومت کے پاس نہو، تو یہ زیادتی بصورت قرض کے ہوگی جو رعایا کی طرف سے حکومت پر ہوگا، لیکن اس پر کچھ سود نہ لیا جائیگا اور جب تک رعایا کو حکومت کی مالی حالت پر اعتبار رہے نوٹ کی قیمت کم نہ ہوگی، اور اگر یہ اعتبار جاتا رہا تو ہزار روپیہ کا نوٹ پانچ روپیہ میں بھی مشکل سے چلے گا، جیسا کہ آج کل روس میں ہو رہا ہے۔

جس طرح نوٹ اور روپیوں سے معاملہ ہوتا ہے اسی طرح ورقہ تحویل (ہنڈی) سے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ جب کسی خاص شخص یا خاندان کی مالی حالت پر اعتبار ہوتا ہے تو ورقہ تحویل کی اہمیت نوٹ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

حکومت بعض اوقات رعایا سے قرض لیتی ہے اور اس قرض کی رسید یا سند، قرض دینے والے کو دیتی ہے یہ رسید یا سند بھی بطور زر نقد کے چل سکتی ہے، اس میں اور نوٹ میں یہ فرق ہے کہ نوٹ (جبکہ خزانہ میں اسکی مقابل روپیہ نہو) کے ذریعہ سے جو قرض حکومت پر ہوتا ہے اس میں سود نہیں ملتا اور جو روپیہ سند قرض کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے اس پر کچھ سود بھی لگایا جاتا ہے۔ معتبر کمپنیوں کے حصص سے بھی تعامل ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوگیا کہ جس طرح زر مسکوک یا غیر مسکوک سے معاملہ ہوتا ہے، اسی طرح نوٹ، ورق تحویل، سند قرض اور حصہ شرکت سے بھی ہوسکتا ہے اور کسی جگہ روپیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

سوال مذکور (یعنی حکومت کے پاس تین ملیار ڈپونڈ کہاں سے آئے) کا دوسرا جواب یہ ہے کہ چونکہ حکومت

اس رقم کو یکبارگی خرچ نہیں کرتی بلکہ جس طرح اس کے محاصل تدریجاً جمع ہوتے ہیں اسی طرح اس کا صرف بھی تدریجی ہوتا ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ خزانۂ حکومت میں سونے کی یہ عظیم الشان مقدار پوری پوری موجود رہے۔ اسے مثالاً یوں سمجھنا چاہیئے کہ آج حکومت نے علاوہ مختلف محاصل کی آمدنیوں کے ۔۰۰ہ ملین پونڈ قرض لئے اور اُسے اوراق ونقود کی صورت میں اپنے خزانہ میں رکھا پھر اُسے تدریجاً خرچ کرنا شروع کیا۔ یہانتک کہ سب خرچ ہوگیا، پھر اس نے دوسرا قرض لیا اور اُسے بھی اسی طرح خرچ کردیا یہاں تک کہ اس کے کل مصارف حربی ۳ ملیارڈ پونڈ ہوگئے۔

بظاہر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جب حکومت رعایا سے قرض لیکر ضروریات جنگ کے فراہم کرنے میں رعایا ہی پر صرف کردیتی ہے تو مال سلطنت سے باہر نہیں جاتا اور راعی و رعایا کے درمیان گردش میں رہتا ہے، علی الخصوص حالتِ جنگ میں کہ حکومت سونے کا باہر نکلنا بالکل بند کردیتی ہے اور جب حکومت رعایا کا قرض انہیں پر ٹکس لگا کر ادا کردیتی ہے تو ایسی صورت میں حکومت جا ہے جتنا صرف کرے، ملک کا کچھ نقصان نہیں ہوتا، کیونکہ ملک کا روپیہ ملک ہی میں رہتا ہے، لیکن اس قسم کے اعتراضات اکثر وہی لوگ کرتے ہیں جو اقتصادی حقائق سے واقف نہیں ہیں۔

نقصان سے حقیقی مقصود کیا ہے | اس قسم کے اعتراض کا منشا یہ ہوتا ہے کہ معترض روپیہ کو قیمت سمجھتا ہے، حالانکہ نفس روپیہ کی کوئی قیمت نہیں ہے، کیونکہ روپیہ، نہ لڑنے والا سپاہی ہے، نہ چلنے والی توپ، نہ اسلحہ سازی کا کارخانہ ہے، اور نہ کوئی کھانے کی چیز، بلکہ روپیہ کے ذریعہ سے صرف عامل کی قوت عاملہ متعین کی جاتی ہے۔ عامل یا مزدور روپیہ پیدا کرتا ہے، روپیہ عامل کو پیدا نہیں کرتا، اگر آپ کے پاس ایک پونڈ ہو، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ ایک معین مدت کے لئے آپ کسی مزدور کی قوتِ عاملہ کام میں لاسکتے ہیں، اگر آپ کو کسی عمل یا نتیجہ عمل (مثلاً کھانا یا اسلحہ وغیرہ) کی ضرورت ہو اور آپ کو نہ عامل مل سکے اور نہ اس کے عمل کا نتیجہ، تو آپ کے روپیہ کی کوئی قیمت نہیں ہے اور نہ وہ کسی کام آسکتا ہے نہ آپ اُسے کھا سکتے ہیں نہ پہن سکتے ہیں۔

برطانوی حکومت نے مثلاً ایک سو ملین پونڈ قرض لئے اور اندازہ یہ ہے کہ ایک پونڈ میں ایک مزدور ایک ہفتہ کام کرسکتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حکومتِ مذکورہ ایک ہفتہ تک سو ملین مزدوروں سے کام لے سکتی ہے یا دس ملین مزدوروں سے دس ہفتہ تک کام لیا جاسکتا ہے اور جب اس نے دس ملین پونڈ دس ہفتہ میں صرف کر ڈالے تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ اُس نے اس مدت میں دس ملین مزدوروں کی قوت صرف کی۔

ایک سلطنت نے جنگ میں تین ملیارڈ پونڈ صرف کئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ۲۳ ملین مزدوروں سے ۱۳۰ ہفتہ کی مدت تک کام لیا۔ یا یوں کہئے کہ قوم نے اس مدت میں ۲۳ ملین مزدوروں کی قوت عاملہ صرف کی اب دیکھنا چاہیے کہ یہ نقصان کس کا ہوا؟ قوتِ عاملہ کا، کیونکہ اگر ہم اس مسئلہ پر ایک عام اجتماعی حیثیت سے نظر ڈالیں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ قوتِ عاملہ جسے سلطنت نے اپنے مصالح کی حفاظت میں صرف کیا ہے اگر جنگ نہ ہوتی تو کسی دوسرے مفید کام میں لگائی جاتی اور چھ سال کی مدت میں جو حالتِ جنگ میں بسر ہو گئی اس سے کہیں بہتر فوائد حاصل کئے جا سکتے تھے۔

حکومت مقروض کیوں ہوتی ہے

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ جب نقصان مالی نہیں بلکہ اصل خسارہ قوت عاملہ کا ہے تو حکومت روپیہ کیوں قرض لیتی ہے، بلکہ اسے درمیان سے الگ کر کے براہ راست قوتِ عاملہ کو کیوں نہیں قرض لیتی۔

بات یہ ہے کہ جب ایک پونڈ ایک معینہ مدت کے لئے قوتِ عاملہ کی تعیین کرتا ہے، تو نتیجہ میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ پونڈ دے کر عامل کی قوتِ عاملہ یا نتیجہ عمل کو خریدنا یا براہ راست عامل سے کام لینا بالکل برابر ہے، لیکن بات یہ ہے کہ روپیہ کے ذریعہ سے کام زیادہ آسانی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے کیونکہ روپیہ کا جتنا چاہیے تجزیہ ہو سکتا ہے اور جہاں چاہیں اُسے لے جا سکتے ہیں۔

جب حکومت، رعایا سے قرض لے کر اُسے سپاہی کی تنخواہ، مزدور کی اجرت، غذا و لباس میں صرف کرتی ہے، تو پھر اس قرض کو رعایا پر ٹیکس لگا کر ادا کر دیتی ہے، اس لئے جب حکومت کا قرض لینا اور اس کی ادا کرنا اس اسلوب پر ہے تو حقیقت میں نہ حکومت مقروض ہوتی ہے اور نہ رعایا بلکہ کل قوم بلا کسی معاوضہ اور اُجرت کے جنگ میں مصروف ہو جاتی ہے۔

قرض لینے، خرچ کرنے اور پھر اس کے ادا کرنے میں حکومت کا درجہ ایک محاسب سے زیادہ نہیں ہے۔ جو لوگ جنگ میں شریک نہیں ہوتے یا نہیں ہو سکتے وہ اپنے مال کا ایک حصہ لڑائی میں شریک ہونیوالوں پر صرف کرتے ہیں گویا حالتِ جنگ میں عام افراد پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ بلحاظ قابلیت و صلاحیت ان پر تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ کوئی شخص اپنا مال صرف کرتا ہے اور کوئی میدانِ جنگ میں اپنی جان دیتا ہے، جنگ میں شرکت نہ کرنے والے افراد پر جو ٹیکس لگائے جاتے ہیں وہ اسی لئے ہیں کہ تمام قوم جنگ میں حصہ لے، کیونکہ دفاعِ وطنی کا فرض براہ راست ہر ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔ ہاں ٹیکس لگانے میں افراد کی آمدنی کا بھی

لحاظ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یورپ میں لڑائی کے ٹیکس ہمیشہ آمدنی کی نسبت سے ہوتے ہیں، حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قرض و ٹیکس کے حسابات مرتب کرے تاکہ کوئی فرد کسی پر تعدی نہ کر سکے۔

جنگ کا نظام اشتراکی ان مختصر معلومات کے بعد ہم پھر اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اشتراکیت حربی کو واضح کرنے کی غرض سے سب سے پہلے ہم جرمنی کو پیش کرتے ہیں، کیونکہ اسی نے سب سے پہلے ان اصول پر عمل کیا اور نہایت وسیع معنوں میں اپنے ملک میں اسے رواج دیا۔ اس نے رعایا کے تمام افراد کو بلا استثنار نظام فوجی کے ماتحت کر دیا تھا یہاں تک کہ عورتیں بھی اسی نظام کے تحت میں تھیں۔ جرمنی نے صرف اپنی رعایا پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی سلطنت میں جس قدر اجنبی ممالک کے لوگ ہیں انہیں بھی شامل کر لیا تھا۔

موجودہ نظام اور نظام اشتراکی کا فرق موجودہ نظام اور اشتراکیت حربی کے درمیان فرق بالکل ظاہر ہے۔ موجودہ نظام میں جو لوگ جنگ کی صلاحیت رکھتے ہیں، انہیں فوجی اقتدار کے تحت میں کر دیا جاتا ہے اور وہ مزدور جو اسلحہ سازی کے کارخانوں میں یا دوسری حربی ضروریات کی طیاری میں کام کرتے ہیں، انھیں خدمت پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ اور نہ وہ نظام فوجی کے ماتحت ہوتے ہیں، اور انہیں کام پر مجبور کرنے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں ہوتی کہ اجرت بڑھا کر ان کو کام کرنے کی رغبت دلائی جائے، اسی لئے مجبوراً اجرت پوری کرنیکے لئے قرض لینا پڑتا ہے اور بسا اوقات ایسی صورت بھی پیش آتی ہے کہ باوجود کافی اجرت دینے کے کام کرنے والے نہیں ملتے اور نہ معقول قیمت ادا کرنے پر ضروریات فراہم ہو سکتی ہیں، اور مزدوروں کی قلت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب تندرست اور توانا آدمی فوج میں داخل ہو جاتے ہیں، تو لامحالہ مزدوری کے لئے لوگ مشکل سے جمع ہوتے ہیں۔

موجودہ نظام، قوم کی تمام قوتوں سے کام نہیں لے سکتا اور نہ ایسے سخت موقع پر قربانی اور ایثار کے لئے افراد ملت میں مساوات قایم رکھ سکتا ہے، کیونکہ کم عمر، بوڑھے اور عورتیں جو فوجی خدمت انجام نہیں دے سکتیں، اُن سے سوائے وصولی ٹیکس کے اور کوئی کام نہیں لیا جا سکتا اور اس وصولی میں وہ دوسرے تندرست و توانا افراد کے برابر رہتے ہیں، حالانکہ یہ انصاف نہیں ہے، ایک فریق اپنی جان و مال کو قربان کر رہا ہے اور دوسرا صرف اپنی آمدنی کا زائد حصہ صرف کرتا ہے۔ ایک ٹیکس ادا کرنے کے بعد بدستور راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دوسرا میدان جنگ میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

جدید اصول یا نظام اشتراکی اس کے بالکل خلاف ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ جس فرد میں دفاع وطن کی جتنی قابلیت اور صلاحیت ہو اس سے پورے طور پر کام لینا چاہئے، طاقتور، کمزور، مالدار، فقیر، عورت،

مرد، کم سن، اور بوڑھا ہر ایک کو اپنی امکانی کوشش اور ممکن طاقت لڑائی کو کامیاب بنانے میں صرف کرنی چاہئے۔

افراد کا سرمایہ حکومت کے ہاتھ میں

یہ نظام، جنگ کے موقع پر زراعت، صناعت اور تجارت، غرض ہر قسم کے سرمایہ کو اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ ایسے وقت میں مزارع، صناع، اور تاجر کی حیثیت محض ایک نوکر اور مزدور کی رہ جاتی ہے اور تمام انتظامات حکومت کے قبضہ میں ہو جاتے ہیں۔ ضرورت کے وقت حکومت، ملک کی تمام اجناسِ خام پر بھی قبضہ کر لیتی ہے اور لوگوں کو صرف پکا ہوا کھانا ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کس قدر اقتصادی منافع ہیں۔ بعض وقت حکومت مزدوروں کو اپنے پاس سے کھانا دیتی ہے اور اس کی قیمت اُن کی اُجرت سے وضع کر لیتی ہے۔ یہ نظام افراد کے درمیان اس قدر ارتباط و استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ تمام قوم ایک خاندان بن جاتی ہے، جو سب سے پہلے واجبات حربی اور ضروریاتِ فوجی کو فراہم کرنے میں کوشش کرتی ہے اور اس کے بعد جمہور کی غذا، لباس اور دوسری ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

نظامِ اشتراکی کے فوائد

(۱) اس نظام کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ حکومت کو زیادہ قرض لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، خاص کر جب کہ وہ مزدوروں کی اُجرتیں کم کر کے صرف اس حد تک محدود کر دیتی ہے کہ اُن کی ضروریات پوری ہو سکیں اور باقی رقم کو میدانِ جنگ میں صرف کر دیتی ہے

۲۔ یہ نظام تمام متمول افراد کو بھی کام کرنے پر مجبور کرتا ہے حالانکہ سابقہ نظام میں وہ ٹیکس ادا کر کے آرام کی زندگی بسر کرتے تھے، ظاہر ہے کہ ایسے افراد کی تعداد بھی کم نہیں ہوتی، اور جب یہ لوگ نظامِ اشتراکی کے ماتحت ہو جاتے ہیں تو مجبوراً انہیں کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے، غرض انکی قوت و ثروت بیکار نہیں جاتی۔

۳۔ نظامِ اشتراکیت کے ماتحت پبلک فضول خرچی نہیں کر سکتی، اور نہ اپنے روپیوں کو کھیل تماشوں میں اُڑا سکتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سرمایہ تو حکومت کے قبضہ میں ہوتا ہے اور وہی سب ضروریات رعایا پر تقسیم کرتی ہے۔

۴۔ نظامِ اشتراکی، مالدار اور فقیر میں بڑی حد تک مساوات پیدا کر دیتا ہے فرق صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ ہر ایک کو اُس کی ذاتی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق ملتا ہے لیکن محروم کوئی نہیں رہتا۔

۵۔ یہ نظام لڑائی کے موقع پر تمام زوائد اور غیر ضروری امور کو بند کر دیتا ہے، مثلاً تھیٹر، کھلونے بنانے والے کارخانے، غیر ضروری اخبارات و رسائل وغیرہ سب بند کر دیئے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس میں کس قدر بچت ہے۔

۶- نظام اشتراکیت فی نفسہ اعتقاد اور میانہ روی کا سبق دیتا ہے، افراد کے قوائے عاملہ سے مناسب طریقہ پر کام لیتا ہے۔ مثلاً بجائے اس کے کہ ایک چھوٹے شہر میں ۱۰۰ حمام ہوں تو صرف ۱۰ پر اکتفا کرتا ہے۔ اور یہ سب چونکہ ایک متحدہ نظام کے ماتحت ہوتے ہیں، اس کے انتظامات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

ان فوائد کے علاوہ اور بھی منافع ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ نظام اشتراکیت حالت جنگ ہی میں بہت ضروری ہے۔ امن کی حالت میں مناسب نہیں کیونکہ آزادی ہر فرد کا فطری حق ہے، جو اشتراکی اصول کے اجرار سے بالکل باطل ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ جتنا چاہے کمائے اور جتنا چاہے خرچ کرے۔ ہاں اگر اس کے مکاسب اور اشغال جمہور کو نقصان پہونچاتے ہیں تو ایسی صورت میں حکومت انہیں ضرور روک سکتی ہے۔ اسی طرح اگر راعی و رعایا کے درمیان تصادم اغراض ہو جائے اور حکومت سے ترک تعاون ضروری قرار پائے، تو یہ نظام اک بہترین حربہ ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی سلطنت نہیں کر سکتی۔

نیاز

وردِ احمر

اس عنوان سے جناب تسکین (سوروتی) کی ایک نظم موصول ہوئی ہے جس کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اڈیٹر

تو مرقع ہے کسی کے دیدۂ مخمور کا — تجھ میں کھنچ کر آ گیا ہے رنگ روئے حور کا
تجھ سے ملتا ہے نشاں زخمِ دلِ رنجور کا — تو کوئی ہلکا سا شعلہ ہے چراغِ طور کا
تیری رگ رگ میں بھری ہے شوخیِ رنگِ شباب
تیرے سازِ حسن دلجو میں ہے آہنگِ شباب

تو کلی تھا گل چمن میں مسکرانے کے لئے — پھول ہے تو آج میرا دل لبھانے کے لئے
یاد رکھ، گلشن میں تو آیا ہے جانے کے لئے — تجھ کو لے جائیں گے تربت پر چڑھانے کے لئے
تیرے نظارہ سے ہوتی ہے پریشانی مجھے
خون رلواتی ہے، تیری چاک دامانی مجھے

تسکین قریشی (سوروتی)

اندلس کی شہزادی

(۴)

(بہ سلسلہ اشاعتِ ماسبق)

حسن، فرشِ خاک پر سرنگوں بیٹھا تھا اور بار بار سوچتا تھا کہ جبیبہ سے کیونکر ملے۔ کبھی غور کرتا کہ رات کو چھپکر نکل جائے، کبھی اس خیال سے مطمئن ہو جاتا تھا کہ رہائی میں چند روز اور باقی رہگئے ہیں، اور کبھی گھبرا کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگتا تھا۔ الغرض وہ اسی حال میں مبتلا تھا کہ جیل کے دروازے پر اُسے وہی ضعیفہ جو عیسائی وزیر کے دربار میں محمل کی ہمراہ تھی، داروغہ جیل سے کچھ کہتی ہوئی نظر آئی۔ یہ دیکھکر، وہ بے اختیار بڑھیا کی طرف دوڑا، اور پوچھنے لگا "کیوں کیا ہے؟ پیاری جبیبہ کس حال میں ہے؟" بڑھیا نے حسن کے ہاتھ میں ایک خط دیا، داروغہ جیل نے چاہا کہ اُسے روکدے، بڑھیا نے چند اشرفیاں داروغہ کو دیں، اور وہ لیکر خاموش ہو گیا۔

"میری روح کے مالک، تمہاری تکلیف کے تصور سے میری روح عذاب میں مبتلا ہے۔ تمہارے نہ ہونے سے میری ہر رات سیاہ پوش ہے اور آسمان کے ہر ستارہ کا قدم شکست ہو گیا ہے۔ ہر صبح مجھ پر ہنستی ہے اور ہر شام میرے لئے سامانِ مایوسی لیکر آتی ہے۔ کیا اس دور میں کوئی ساعت ایسی آئیگی، جب ایک نظر میں تمہیں دیکھ سکونگی؟"

حسن نے خط پڑھکر ایک آہ سرد کھینچی، ایسی آہ جس نے داروغہ جیل کو بھی متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا۔ داروغہ نے پوچھا "کیا ہے؟" حسن نے کہا "مجھے قلم کاغذ لا دو"۔ داروغہ نے فوراً تعمیل کی، کیونکہ اب اُسے بہت کچھ مادی منفعت کی امید ہو گئی تھی۔

حسن نے جواب میں لکھا۔ "اے آسمانی حور! قدرت نے جس تاریک دل کو گہوارہ عشرت میں پرورش کیا ہے، اسے کیوں غمناک کیا جا رہا ہے؟ اگر تو مجھے اس تاریک زنداں میں خوش رکھنا چاہتی ہے، تو خود اپنے تئیں مسرور رکھ۔ وہ دن دور نہیں جب میں اس تاریکی سے نکل کر تیری روشنی کے سایہ میں نشیمن بناؤنگا۔ ہاں میں تیرے لئے بیتاب ہوں، اس طرح بیتاب ہوں، جس طرح ایک مچھلی دریا کے خشک کنارے پر پانی کے لئے تڑپتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج شب کو ایک بجے جس طرح ممکن ہو، قصرِ شاہی کے پائیں باغ تک پہنچکر تیرے جمال باصرہ نواز سے لطف اندوز ہوں۔ امید ہے کہ اس وقت میرا انتظار کیا جائے گا۔"

شہزادی جبیبہ جو شام ہی سے انتظار کر رہی تھی، ایک گلابی عربی وضع کا عروسی لباس زیب تن کئے ہوئے پائیں باغ کے دریچہ میں ایک مرصع کرسی پر بیٹھی تھی، دروازوں پر دیبا و حریر کے پردے پڑے تھے اور قصر کے اندر مختلف رنگ کے فانوس روشن تھے، جن کی روشنیاں ریشمی پردوں سے چھن چھن کر صحن

باغ کے لہلہاتے ہوئے قطعوں پر پڑ رہی تھیں۔ موسم برشگال کی راتوں کا چاند ہلکے ہلکے سفید بادلوں میں زر بافی کا کام کر رہا تھا۔ رات کی خاموشی، ہوا کا سکوت اور فضائے چمن کی بہار، اس وقت ہر اُس آنکھ کے لئے ایک کیف تھا، جو کسی کے ذوق انتظار میں بیدار ہو۔

حبیبہ ابھی اپنی خیالی گفتگو میں محو تھی کہ دفعتاً حسن آ گیا اور صبح تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔

(۵۱)

حبیبہ حیرت زدہ ہو کر بولی: "حسن! حسن! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہی جو اس وقت میرے باپ نے کہا تھا، جبکہ تم نے اُس عیسائی وزیر کے مکان پر میری مدد کی تھی؟ ہاں میں سمجھ گئی تم اسی کا بدلہ چاہتے ہو"۔

لیکن آہ۔ کیا میں کسی ایسے شخص سے شادی کر سکتی ہوں جو دوسروں کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہو؟ جس نے اپنی قوم کی سطوت و ہیبت اپنے ہاتھوں سے تباہ کی ہو، کیا وہ مرد اس قابل ہے کہ شریف، بہادر عورت اُس کی بیوی بن سکے؟ میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنے عزیز ترین بہادروں کا خون کرایا ہے، تم نے آگ اور خون کے سمندر بہا دینے کے مشورے دئے ہیں۔ وہ ہولناک آتش زدگیاں اور ہلاکت بار تلواریں جو عیسائیوں نے میری قوم کے سروں پر چمکائی تھیں، مجھے یاد ہیں۔ وہ نازنینان حرم جنہوں نے کسی غیر محرم کی نظر نہ دیکھی تھی، کس نے انہیں بے حرمت کیا؟ وہ شیر خوار بچے جو ابھی معصومیت کے گہوارہ میں سو رہے تھے، کون تھا جس نے انہیں خاک و خون میں آلودہ کرایا؟ اور آج مجھ پر اور میرے خاندان پر آلام و مصائب کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں اس کا باعث کون ہے؟ کیا وہ نہیں جنہوں نے قوم فروشی و غداری اختیار کی؟ کیا عیسائی بغیر ہمارے قومی غداروں کی مدد کے ہم پر قابو حاصل کر سکتے تھے؟ (اپنی سیاہ ابرو کو چڑھا کر) حسن، کیا میں کسی ایسے مرد کی دلہن بن کر رہ سکتی ہوں جو دوسروں کا غلام ہو؟ نہیں، نہیں، میں جنگلوں میں نکل کر خشک درختوں کا سہارا لونگی، سانپوں اور بچھوؤں سے اپنا دل بہلاؤنگی اور شیروں کے آگے اپنے آپ کو ڈال دونگی اور کسی غلامی پسند مرد کے ساتھ شادی کرنے سے قبل اپنے سہاگ میں آگ لگا دونگی۔

حالت غضب میں شہزادی کے رخسار شعلہ کی مانند سرخ تھے، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور اس کے تنفس سے انتقام کی بو آ رہی تھی۔

حسن خوف و ندامت سے کانپ رہا تھا، اس کی ہمت جواب دے چکی تھی اور اُس کا ضمیر اُس پر لعنت کر رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حسن نے سر اُٹھایا، نیام سے تلوار نکالی اور یہ کہکر "ہاں میں ابھی

خائف ہوں۔" حبیبہ کے آگے ڈالدی اور کہا " اے میری روح کی مالک، خدارا اپنے ہاتھ سے اس سر کش کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دے۔ کیونکہ اب میری نجات اسی میں ہے۔"

حبیبہ نے تلوار اٹھالی اور جواب دیا " میں اس تلوار سے اس عیسائی وزیر کا سر اُڑادونگی، جس نے میرے ملک کا خون بہایا ہے اور جس نے اپنے دربار میں میرا محل منگا کر مجھے بے پردہ کیا۔ ہر چند میں عورت ہوں، لیکن ایک بہادر مرد کا کام بھی کر سکتی ہوں۔"

حسن نے اس کے دست نازک کا بوسہ لیکر تلوار اپنے ہاتھ میں لیلی اور کہا " پیاری حبیبہ، اس کام کے لئے ابھی حسن زندہ ہے۔"

(۶)

حسن ایک ویران سڑک پر تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک آبدار تلوار تھی اور دل میں ایک زریں آرزو۔ کچھ فاصلہ طے کرکے وہ وزیر کے مکان تک پہونچا۔ دیکھا کہ دروازے پر دو پہرے والے سردی میں کمبل اوڑھے ہوئے پڑے ہیں، وہ آہستہ آہستہ وہاں سے گذر کر مکان کے دوسرے دروازے پر پہونچا۔ یہاں ایک سپاہی بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ جونہی اس نے حسن کے آنے کی آہٹ سُنی چونکا، لیکن حسن نے اُسے سنبھلنے نہ دیا اور ایک ہی وار میں فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد اُس کیلئے راستہ خالی تھا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا وزیر کے کمرہ میں داخل ہوا۔ کمرہ کے اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی اور وزیر ایک زرنگار مسہری پر غافل سو رہا تھا۔ حسن نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنے منہ اور آنکھوں پر پھیرا، اور آہستہ سے مسہری پر چڑھکر وزیر کے سینہ پر بیٹھ گیا وزیر چونکا اور کہا " کون ہے ؟" حسن نے کہا میں ہوں، وہی حسن جس نے شہزادی حبیبہ کی مدد کی تھی اور جس جرم پر تو نے مجھے سزائے قید دی تھی۔ وزیر طیش میں آکر چاہتا تھا کہ تڑپ کر اُٹھے لیکن حسن نے ایک ایسا کاری ہاتھ مارا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ خون کے چھینٹوں سے مسہری اور حسن کے کپڑے تر ہو گئے۔ وزیر تڑپ رہا تھا لیکن حسن نے اپنا کام نہایت دلیری سے کیا۔ وہ وزیر کا سر تن سے جدا کرکے شہزادی کے پاس لے گیا اور اس کے قدموں پر ڈال دیا۔ شہزادی خوف سے متحیر ہوئی اور کہا " آج حسن فرہاد ثانی نظر آرہا ہے " حسن نے جواب دیا " ہاں لیکن گیا حبیبہ مجھے شیریں نظر نہیں آتی "؟

شہزادی :- اب اس ناپاک سر کا کیا کروگے ؟

حسن :- جو حکم ہو۔

شہزادی :- اسے جلد ضائع کر دیا جائے تاکہ عیسائیوں کو سراغ نہ لگ سکے۔

(۷)

صبح ہوتے ہی شہر غرناطہ میں وزیر کے قتل کی خبر بجلی کی طرح ہر طرف دوڑ گئی۔ ہر جگہ یہی شور تھا یہی چرچا تھا کہ آج وزیر دربار کسی کے ہاتھ سے قتل ہو گیا، لیکن قاتل کا پتہ نہیں۔

زیادہ دن نہ چڑھنے پایا تھا کہ چند مسلح سواروں نے حسن کے مکان کا محاصرہ کر کے اُسے گرفتار کر لیا اور ایک کاغذ کا پرچہ دکھا کر کہا "یہ کس کا ہے؟"

حسن نے پہلی ہی نظر میں پرچہ پہچان لیا۔ کیونکہ یہ شہزادی حبیبہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ پرچہ تھا۔ جسے اس نے خادمہ کے ہاتھ حسن کے نام جیل میں بھیجا تھا، اور جسے حسن حرز جان بنا کر ابھی تک اپنی جیب میں رکھے ہوئے تھا۔ وزیر کے قتل سے پہلے اس نے جیب سے جب رومال نکال کر اپنے منہ پر پھیرا تھا تو اسوقت اس کے ساتھ یہ پرچہ بھی نکل کر فرش پر گر گیا تھا۔ صبح تلاش کرنے والوں میں سے ایک شخص کی نظر اُس پر پڑ گئی، اور بالآخر یہی اس کی گرفتاری کا باعث ہوا۔ حسن کے قاتل ہونے کا پورا ثبوت مل گیا۔ اور اس جرم پر اسے پھانسی کا حکم دیدیا گیا۔

سنا ہے اور سچ بھی ہے کہ جب کوئی منحوس ساعت آتی ہے تو وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہیں رہتی، باد مخالف جب چلتی ہے تو ہمیشہ مسافرانِ بحر کو ساحل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ رو دیئے اُس مسافر بیکس پر جس کے پاؤں تلاش میں جبکہ منزلِ مقصود نظروں کے سامنے ہو، ایک تیر زہر یلا کانٹا چبھ کر رہ گیا ہو۔ کون سا مورخ ہے، جس کا قلم لکھ سکے، کون سا خطیب ہے جس کی زبان کہہ سکے کہ حسن کی پھانسی کی خبر نے شہزادی حبیبہ کی روح پر کیا اثر کیا؟ اس کی روح اس مرغ کی طرح تڑپنے لگی، جسے نیم بسمل کر کے چھوڑ دیا جائے۔ اس نے اپنے حریری لباس کی دھجیاں اُڑا دیں، اپنی سیاہ زلفیں نوچنے لگی، اپنے حسین بدن پر نیل ڈال لئے، ایسے نیل جیسے زمرد کے ٹکڑے، اس کی روح فضائے غم کی تاریکی میں چھپ گئی، اور حبیبہ ایک مجسمہ درد و الم بن گئی۔

پھانسی کی منحوس ساعت آئی اور صبح سے لوگ گروہ در گروہ جمع ہونے لگے۔ ایک ہل چل تھی، ایک قیامت تھی اور مسلمانوں کے چند پریشان نفوس تھے، جن میں کوئی رو رہا تھا، اور کوئی عیسائیوں کے خوف سے رو بھی نہ سکتا تھا، اگرچہ انہیں رونا نہ آتا تھا لیکن اُن کے دل رو رہے تھے۔

اس ہنگامہ قیامت زا میں، چند مسلح سپاہی تھے، جن کے حلقہ میں حسن اس لباس میں لایا گیا جو لباس

اُس وقت ایسے مجرموں کے لئے مخصوص تھا، ابھی پھانسی کے وقت میں چند منٹ باقی تھے، کہ جلاد نے حسن سے کہا "اس وقت تیری کیا خواہش ہے؟" حسن نہایت ہی بشاش تھا، مسکرا کر بولا "اے عفریتِ اجل، اس سے زیادہ میری کوئی خواہش نہیں کہ مجھے ایک لمحہ دیا جائے تاکہ میں اپنی پیاری جمیلہ کا آخریں نظارہ کر سکوں، اور اسی کی نگاہوں کے روبرو مجھے سولی دی جائے، تاکہ میری روح اس نظارہ کے عمق میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ڈوب جائے۔"

چنانچہ شہزادی جمیلہ اُس کے روبرو لائی گئی۔ وہ ایک سفید سنگ مرمر کے بت کے مانند تھی، اُس کا نازک جسم سرد تھا، اس کی آنکھوں میں پتلیاں غیر متحرک تھیں اور اُس کے سازِ ہستی کے آخریں تنفس سے نغمۂ غم کی صدا آ رہی تھی۔

حسن نے اپنی کانپتی ہوئی آواز سے شہزادی کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ لیکن، افسوس، اس کی آواز بند تھی۔ اس کی متحرک زبان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی حسن نے کوثرِ لب کا ایک جام پیا اور پھانسی پر چڑھ گیا۔

شہزادی نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور اس ہولناک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اُس کے لبوں میں ایک جنبش تھی، بدن میں ایک کپکپی، جو روح و جسم کی مفارقت کے وقت طاری ہوتی ہے!

غزل

امام

چاہتے ہیں وہ کہ اظہارِ شکایت چھوڑ دوں
یعنی الفت چھوڑ دوں، اُس کی حکایت چھوڑ دوں

دیکھ کر تم کو مری آنکھوں میں آنسو بھی نہ آئیں
کس طرح اظہارِ شوقِ بے نہایت چھوڑ دوں

مجھ کو خوش آتی ہے کیا یہ بیقراری چارہ گر
بس میں ہو تو میں ابھی اسکی محبت چھوڑ دوں

دیکھ کر مجھ کو خیالِ ترکِ الفت چھوڑ دو
میں بھی تم کو دیکھ کر رونے کی عادت چھوڑ دوں

کیا یہ انجامِ محبت مجھ کو پھر چھوڑ سے کہیں
گر خیالِ ابتدائے عہدِ الفت چھوڑ دوں

تم نہیں آتے تو ذکر اپنا مجھے کرنے ہی دو
شوقِ دل کی دفعۃً کیونکر رعایت چھوڑ دوں

میں نہ آؤں بزم میں اور تو مرے دل میں رہے
چھوڑ تو خلوت مری، میں تیری جلوت چھوڑ دوں

تم سے مل کر بس یہی جی چاہتا ہے کچھ کہوں
کیا کہوں، گر شکوہ بنجھائے الفت چھوڑ دوں

جان دیدوں کیوں نہ گر کر اسکے قدموں پر نیاز
شکرِ احساں چھوڑ دوں، اظہارِ منت چھوڑ دوں

معلومات

آفاتِ بحر سے بچنے کے جدید وسائل

آج کل بحری مسافروں کو ڈوبنے سے محفوظ رکھنے اور ڈوبتے ہوئے کو بچانے کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کرتا جاتا ہے اور جب سے جہاز ٹیٹانک (جس کے محفوظ ہونے پر بہت زیادہ اعتماد تھا) غرق ہوا ہے، اس وقت سے تو ماہرین فن نے اس مسئلہ کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں آبدوز کشتیوں نے اس قدر جہاز تباہ کئے، اتنی جانیں تلف کیں کہ اُن کے خطرہ نے سارے یورپ کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، اور ان سے محفوظ رہنے کے لئے آج کل کے ماہرین فن مختلف قسم کی تدابیر سوچ رہے ہیں، لیکن اس وقت تک جس قدر وسائل اور ذرائع کام میں لائے گئے ہیں وہ کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئے۔ جب تارپیڈو کے پھٹ جانے سے سمندر میں ایک تموج عظیم پیدا ہو جاتا ہے اور جہاز کے پرزے پرزے ہو جاتے ہیں، تو اس وقت بقیہ لوگوں میں اتنا ہوش بھی باقی نہیں رہتا کہ وہ اُن وسائل کا استعمال کر کے اپنے کو بچا سکیں۔

ہم ذیل میں مختصر طور پر ان وسائل کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے انسانی جانیں اس خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔

دفعتہً غرق ہو جانے کے خطرے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔

دفعتہً غرق ہونے کا واقعہ طوفان، تصادم، راستہ گُم کر دینے، آگ لگ جانے، آبدوز کے حملے اور سرنگ سے ٹکرا جانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اگر جہاز بنانے والے جہاز کو خوبصورت بنانے اور اس میں ہر قسم کی آرائش پیدا کرنے کے بجائے جہاز کو زیادہ مضبوط اور مستحکم بنائیں اور اس کے دروازے اور کھڑکیاں ایسی رکھیں جن میں سے پانی کا بالکل گذر نہ ہو سکے تو اس قسم کے مہلک خطرات سے بڑی حد تک محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ موسمی انقلاب، چٹانوں سے ٹکرانے اور ساحل پر چڑھ جانے کے خطروں سے صرف جہاز راں کی مہارت اور اس کی ہوشیاری ہی بچا سکتی ہے، البتہ اس کے علاوہ جو خطرات ہیں، اُن سے بچنے کے لئے ایسے آلات اور اسباب ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے، جن سے آگ بجھانے اور لوگوں کو بچانے میں مدد مل سکے۔ انہیں میں لاسلکی آلۂ خبر رساں بھی ہے، جو سمندر کے اندر آواز کو منتقل کر کے جہاز راں تک

پہونچا دیتا ہے اور تصادم کی مصیبت سے محفوظ رکھتا ہے۔

لاسلکی آلۂ خبررسانی کی تفصیل و تعریف کی یہاں ضرورت نہیں ہے، یہ آلہ بہت مشہور ہو چکا ہے اور اس وقت کوئی جہاز اس سے خالی نہیں ہے۔ اس آلہ کے ذریعہ سے سمندر مین چلنے والے متعدد جہاز ایک دوسرے کی حالت معلوم کر سکتے ہیں، نیز ساحل سے گفتگو ہو سکتی ہے اور ضرورت کے وقت ہر قسم کی مدد پہونچ سکتی ہے۔ سمندر میں خبررسانی کی غرض سے جو برقی تار بچھے ہیں وہ بہ نسبت ہوائی تار کے بہت جلد خبر پہونچا سکتے ہیں، ان کی سرعت ہوائی تار سے چارگنی زیادہ ہوتی ہے۔ جہاز چلانے والون نے آپس میں خاص اصطلاحیں مقرر کی ہیں، جنہیں ان تارون کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو پہونچاتے رہتے ہیں۔ ان تاروں کا خاص فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے اندھیری رات اور کُہر کی کثرت مین بھی جہاز آپس میں ٹکرا نہیں سکتے اور اگر سمندر میں کہیں دور سے آبدوز کشتی آرہی ہو، تو اس کی خبر ان تارون کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے۔

آبدوز اور بحری سرنگوں کا خطرہ | اثنائے جنگ میں جرمنی نے آبدوز کشتیوں کے ذریعہ سے نہایت وحشیانہ طریقہ پر جہازوں کو غرق کیا ہے، ان کی آبدوز کشتی بلا کسی اطلاع اور مہلت کے جہاز پر حملہ کر دیتی تھی، کبھی تو وہ مسافروں کو ڈوبتے ہوئے جہاز سے بچنے کی مہلت ہی نہ دیتی تھی اور کبھی انہیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں مین چھوڑ دیتی تھی اور سمندر کی عظیم الشان موجیں انکے ساتھ کھیلتی ہوئی جدھر چاہتی تھیں لیجاتی تھیں۔

آبدوز سے بچنے کا ایک طریقہ یہ نکالا گیا ہے کہ جہاز توپوں سے مسلح کر دیا جاتا ہے اور جہاز کے چاروں طرف نہایت ہوشیار قادر انداز بٹھائے جاتے ہیں جو ذرا سی حرکت محسوس ہونے پر فیر شروع کر دیتے ہیں۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایسے خطرات کے موقع پر جہاز کو خط مستقیم پر نہیں چلاتے، تاکہ آبدوز اس کی سمت نہ ملا سکے، بلکہ اس کی رفتار ایک غیر مستقیم خط پر قایم کرتے ہیں، اور اس طریقہ سے بڑی حد تک تارپیڈو کے خطرات سے حفاظت ہو سکتی ہے۔

سمندر میں ایک بڑا خطرہ سرنگوں کا بھی ہے، یہ سرنگیں صندوق کی شکل میں ہوتی ہیں، جن میں پھٹ جانے والا مادہ بھرا ہوتا ہے اور جب کوئی چیز ان سے مس کرتی ہے تو وہ فوراً پھٹ جاتی ہیں۔

سلطنتوں کا قاعدہ ہے کہ اس قسم کی سرنگیں خاص مواقع پر رکھتی ہیں۔ اس لئے اگر ان مقامات کو چھوڑ کر جہاز گزر جائے تو اس کے لئے کچھ خطرہ نہیں ہے، لیکن بدقسمتی سے بعض وقت یہ سرنگیں خود بخود اپنی جگہ

اپنی جگہ

چھوڑ دیتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں سمندر میں پھرتی رہتی ہیں۔ اور جب کوئی جہاز اُن سے ٹکراتا ہے تو پاش پاش ہو جاتا ہے۔

وسائل نجات جو جہاز میں رکھے جاتے ہیں جہاز میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور لکڑی کے گٹھے بھی ہوتے ہیں جن پر جہاز ڈوبتے وقت لوگ سوار ہو کر اپنی جانیں بچاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑی بڑی لکڑیاں بھی ہوتی ہیں جن پر صرف ایک شخص سوار ہو سکتا ہے۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ اگر بدحواسی کی وجہ سے کوئی مسافر کشتی پر سوار نہ ہو سکے، تو تنہا اس لکڑی پر چڑھ کر اپنی جان بچائے۔ ان چھوٹی کشتیوں میں کچھ کھانا اور پانی بھی رکھا رہتا ہے تاکہ مصیبت زدہ کے لئے کچھ دنوں تک کفایت کر سکے اور ان میں بہت سی رسیاں بھی ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے ڈوبتا ہوا شخص بچایا جا سکتا ہے۔

جہاز میں کارک لکڑی کی بنی ہوئی صدریاں بھی ہوتی ہیں جنہیں پہن کر انسان غرق ہونے سے بچ سکتا ہے۔ یہ سب چیزیں جہاز میں اس طرح رکھی رہتی ہیں کہ فوراً اپنی جگہ سے علحدہ کر کے سمندر میں ڈالی جا سکیں۔

معاہدہ لنڈن ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء کو لنڈن میں ایک اتحادی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس نے بحری مسافروں کے وسائل نجات پر ایک طویل بحث کی تھی اور یہ طے کیا تھا کہ اس کانفرنس کے قواعد ۱۹۱۵ء سے واجب العمل ہوں گے۔ ان میں سے ضروری قواعد یہ تھے۔

۱۔ جہازوں کی کھڑکیاں اور دریچے ایسے ہونے چاہئیں کہ اُن میں پانی بالکل نفوذ نہ کر سکے اور جب وہ سب بند کر دیئے جائیں، تو جہاز ڈوبے نہیں اور برابر سطح سمندر پر تیرتا رہے۔

۲۔ ہر جہاز میں لاسلکی آلۂ خبر رساں کا کافی انتظام ہونا چاہیے، تاکہ رات دن اس کے ذریعہ سے چاروں طرف کے حالات معلوم ہوتے رہیں۔

۳۔ ہر جہاز میں مضبوط کشتیاں اور ہر قسم کا سامان ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ سے ڈوبتے ہوئے لوگ بچائے جا سکیں۔

۴۔ ہر جہاز میں اتنی کشتیاں ہونی چاہئیں جن کے ذریعہ سے پچھتّر ۷۵ آدمی بچائے جا سکیں۔ اور باقی مسافروں کے لئے لکڑی کے ۵ صندوق ہونے چاہئیں جن پر سوار ہو کر وہ اپنے کو محفوظ رکھ سکیں۔

بچانے والے حلقے جہاز میں ایک اور چیز ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے ڈوبتا ہوا شخص بچایا جا سکتا ہے۔ یہ نہایت ہی ہلکے مادے کا بنا ہوا ایک حلقہ ہوتا ہے جس پر ایک مضبوط کپڑا منڈھا رہتا ہے تاکہ پانی

اس میں نفوذ نہ کر سکے۔ یہ حلقہ ۲۵ میٹر طویل رسی کے ساتھ جہاز میں بندھا رہتا ہے، جب کوئی شخص ڈوبنے لگتا ہے، تو فوراً یہ حلقہ اس کی طرف پھینک دیا جاتا ہے، جسے وہ شخص پکڑ کر فوراً اوپر تیرنے لگتا ہے اور آسانی سے جہاز میں کھینچ لیا جا سکتا ہے۔

لکڑی کے گٹھے، صدریاں اور رسیاں

ہر جہاز میں یہ چیزیں کثرت سے رکھی جاتی ہیں علاوہ ان کے ایسی تھیلیاں بھی ایجاد ہوئی ہیں جن میں ہوا بھر دی جاتی ہے اور جسم سے باندھ دی جاتی ہیں اور ایک لباس بھی (کارک لکڑی کا) تیار کیا گیا ہے جس کو پہن لینے کے بعد ایک شخص ڈوبنے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ سے آدمی کس طرح بچائے جاتے ہیں۔

چھوٹی کشتیاں، جن میں جہاز ڈوبتے وقت مسافر سوار ہو کر اپنی جان بچاتے ہیں، جہاز کی بالائی سطح پر رکھی رہتی ہیں، ضرورت کے وقت انہیں اس طرح اتارا جاتا ہے کہ جہاز میں ایک طرف ایک بڑا پہیہ لگا رہتا ہے اور کشتی ایک بڑی رسی سے بندھی رہتی ہے۔ جس وقت جہاز ڈوبنے لگتا ہے یا کوئی اور خطرہ پیش آتا ہے تو آدمیوں کو کشتی میں بٹھا کر رسی اس پہیہ پر چڑھا دیتے ہیں اور جس طرح چرخی کے ذریعہ سے ڈول کنوئیں میں اتارا جاتا ہے، اس طرح آدمیوں سے لدی ہوئی کشتی سمندر میں اتاری جاتی ہے، اور جب وہ سطح سمندر پر پہنچ جاتی ہے تو رسی کھول دی جاتی ہے اور پھر اسی طریقہ سے دوسری اور تیسری کشتی سمندر تک پہونچائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت کس قدر خطرناک ہے اور وقت بھی زیادہ چاہتی ہے۔ علاوہ اس کے ایسے وقت میں جبکہ لوگ بدحواس ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ پہلے میں سوار ہو جاؤں، یہ عمل کس قدر دشوار ہے خاص کر جبکہ جہاز طوفان میں آجائے اور سمندر کی عظیم الشان موجیں جہاز کے بالائی حصہ سے ٹکرانے لگیں اسی لئے خطرات مذکورہ سے حتی الامکان بچنے کے لئے ماہرین بحریات نے کشتیاں اتارنے کے لئے اور بہت سے مفید طریقے ایجاد کئے ہیں جن میں ذیل کا طریقہ سب سے زیادہ آسان اور خطرات سے بڑی حد تک محفوظ ہے۔ اس کے ذریعہ سے نہایت سرعت کے ساتھ کشتیاں سمندر تک پہونچائی جا سکتی ہیں۔ یہ طریقہ کپتان موجر کا ایجاد کیا ہوا ہے:۔

صورت اس کی یہ ہے کہ جہاز کے دوسرے درجہ میں تین یا چار جگہ بڑے بڑے دروازے ہوتے ہیں جن کے قریب لوہے کی پٹریاں رکھی رہتی ہیں، ضرورت کے وقت یہ پٹریاں مشین کے ذریعہ سے سمندر تک پہونچائی جاتی ہیں اور جہاز سے سمندر تک ریل کی طرح ایک لوہے کی سڑک بن جاتی ہے۔

پھر اس سڑک پر مسافروں سے لدی ہوئی کشتیاں یکے بعد دیگرے چھوڑ دی جاتی ہیں جو نہایت آسان اور سرعت سے سطح آب تک پہنچ جاتی ہیں اور اس عمل میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے اور ہر کشتی میں ایک نہایت ماہر ملّاح بھی بٹھایا جاتا ہے۔

نجات کے دوسرے طریقے جب ڈوبنے والا جہاز ساحل کے قریب ہوتا ہے یا کوئی دوسرا جہاز اس کے نزدیک آجاتا ہے تو اس وقت بڑی رسیاں یا زنجیریں اس جہاز سے ساحل تک یا دوسرے جہاز تک پہونچائی جاتی ہیں، یہ رسیاں یا زنجیریں ایک چھوٹی توپ کے ذریعہ سے بھی پہونچائی جا سکتی ہیں جو تین سو میٹر کی مسافت تک انہیں پہونچا دیتی ہے۔ جب زنجیریں ساحل یا جہاز تک پہنچ جاتی ہیں تو اس کے ذریعہ سے مسافر اپنی جان کو بچا لیتے ہیں۔

زنجیروں میں جا بجا ہلکے ہلکے صندوق بندھے رہتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ سمندر میں ڈوب نہیں سکتی اور مسافر نہایت آسانی سے ساحلِ نجات تک پہنچ سکتے ہیں۔

بحری سلطنتیں اپنے سواحل پر جا بجا چھوٹی کشتیاں، زنجیریں اور دوسرے قسم کی وسائلِ نجات رکھتی ہیں تاکہ آسانی سے ڈوبتے ہوئے اشخاص بچائے جا سکیں۔

فرانس کے ایک دولتمند خاندان نے ایک لاکھ فرانک کا انعام اس شخص کے لئے تجویز کیا تھا، جو ڈوبنے والوں کے لئے بہترین وسیلۂ نجات ایجاد کرے، بعد میں اس انعام کے سرمایہ سے فرانس کی انجمن فنون و صنائع نے ایک دائمی نمائش گاہ قائم کی ہے، جس میں ہر ملک کے مخترعین اپنی ایجادیں پیش کر سکتے ہیں۔

دباؤ کا اثر پانی پر

مادی اشیاء پر، دباؤ عجیب غریب اثرات پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ بعض وقت مادہ اپنی اصلی حالت چھوڑ کر بالکل دوسری چیز بن جاتا ہے۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ پانی دباؤ کو قبول نہیں کرتا، یعنی پانی کی معین مقدار دباؤ ڈالنے سے کم نہیں ہو سکتی، لیکن بعد کے تجربات نے ثابت کر دیا کہ اگر پانی پر دباؤ ڈالا جائے تو وہ ۸۰ فی صدی دب جاتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اگر ایک انچ مربع کھولتے ہوئے پانی پر تین لاکھ رطل

وزن کا دباؤ ڈالا جائے، تو وہ فوراً جمکر برف کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور برف بھی عجیب و غریب قسم کا، جو معمولی برف کی طرح پانی پر تیرتا نہیں ہے بلکہ تہہ نشین ہو جاتا ہے۔

ایک عجیب مقدمہ

متمدن دنیا نے آج کل فن جراحی میں اس قدر ترقی کی ہے کہ بلا تامل ایک شخص کے بعض اعضاء قطع کر کے دوسرے کے جسم میں لگائے جا سکتے ہیں، چنانچہ حال ہی میں اس قسم کا ایک عجیب واقعہ نیویارک میں پیش آیا ہے۔ جراح نے کسی شخص کا آپریشن کیا اور اس کا ایک زائد عضو کسی اور کے جسم سے وصل کردیا۔ جب اس شخص کو اس کا علم ہوا تو اس نے جراح پر مقدمہ قائم کرایا کہ "فلاں جراح نے بغیر اجازت میری ملک میں تصرف کیا ہے اور میری چیز دوسرے کے قبضہ میں دیدی ہے۔ چونکہ وہ عضو میرے جسم کا حصہ تھا اور میں ہی اس کا حقیقی مالک ہو سکتا ہوں، اس لئے جراح سے مطالبہ کیا جائے"

عدالت نے مدعی کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ فیصلہ کا مضمون یہ ہے:۔ "انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے متعلقات میں حسب خواہش تصرف کرے، لیکن چونکہ مدعی نے عضو مقطوع، جراح کے پاس چھوڑ دیا تھا اور اس کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، اس لئے اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے حق ملکیت کو چھوڑ چکا ہے"

عالم نباتات میں انسانی تصرف

امریکہ کے ایک عالم نباتات نے ایک خاص قسم کی جوار پیدا کی ہے، جسکا ماخذ ایک معمولی گھاس ہے۔ یہاں ایک گھاس پیدا ہوتی ہے، جسکا نام ٹیوسنٹ (Teosinte) ہے اور اس عالم کا یہ دعوی تھا کہ امریکہ کی جوار اسی گھاس سے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نے مسلسل ۲۰ سال تک اپنی تحقیق کو جاری رکھا اور آخر کار اپنے دعوے کو ثابت کر کے دکھا دیا۔

اس نے ۱۹۰۳ء میں پہلے اس گھاس کی کچھ مقدار بوئی اور اسے بالکل اسکی طبعی حالت پر چھوڑ دیا۔ جب وہ پختہ ہوگئی تو اس میں معمولاً ایک چھوٹا سا خوشہ پیدا ہوا جسکے اندر چھوٹے چھوٹے دانے تھے۔ اسکے بعد امریکن عالم نے وہ دانے چن لئے جو کچھ بڑے تھے اور نسبتاً جوار سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ پھر انہیں بویا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری بار اور زیادہ بڑے دانے پیدا ہوئے۔ اس نے اس عمل کو مسلسل ۲۰ سال تک جاری رکھا یہاں تک کہ اب وہ گھاس بالکل جوار پیدا کرنے لگی ہے۔ نیاز